انجم کدہ

مرتبہ

شفیق کوٹی

مکتبہ سلطانی بمبئی ۳

طبع اوّل ——————— ایک ہزار

اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

قیمت
دو روپیہ
عہ

ناشر

مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر

سلطان حسین تاجر کتب نے اپنے سلطانی فائن آرٹ لیتھو اینڈ پرنٹنگ پریس
میں چھاپ کر بھنڈی بازار بمبئی ۳ سے شایع کیا

فہرست

شاہکار نظمیں

گذارشِ احوالِ واقعی

نظموں اور غزلوں کے مجموعہ کی اشاعت کوئی نئی اور اچھوتی بات نہیں ہے ہر سال پنجاب دہلی وغیرہ سے ایسے انتخابات شایع ہوتے رہتے ہیں لیکن ان میں پارٹی پروپگنڈا یا صوبجاتی عصبیت کے جراثیم اس کثرت سے نمایاں کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا خواہ مخواہ اولجھکر رہ جاتا ہے اور اگر کہیں خوش قسمتی سے کوئی کوشش اس میں کامیاب بھی ہوگئی تو اردو ناشرین کی اقتصادی بدحالی اس کے معیار کو بلند نہیں ہونے دیتی۔

اس مجموعہ کو تجارتی حلقہ بندیوں اور صوبجاتی عصبیت سے پاک رکھا گیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ادب کے شہپاروں کو ناظرین کرام کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس میں بڑے چھوٹے مشہور گمنام کسی شاعر کی تخصیص نہیں کی گئی اور نہ یہ لحاظ رکھا گیا کہ "کس نے کہا ہے" بلکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ "کیا کہا گیا ہے"؟

اس مجموعہ کے پیش نظر کرنے کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ اس

جنگ عظیم کی حشر سامانیوں نے ہندوستان کے ادب و شعر کو کافی متاثر کیا ہے۔ اب سے چند سال ادھر ہماری اساس شعریت پر جن افکار و حوادث کا تسلط تھا ان میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔ چنانچہ ہماری شاعری بھی ماحول اور جنگ کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس میں بھی ایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔ نئے نئے عنوانات کے تحت نظمیں لکھی گئیں نئے نئے رنگ سے غزلوں کو سنوارا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی ہستیاں ایسی ابھر آئیں جنھیں جنگ سے قبل کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ بہتوں نے اپنے رنگ فکر میں زمانہ کے تغیرات کے مطابق تبدیلیاں کر دیں اکثر و بیشتر نظموں کے رجحانات مغربی اسلوب بیان سے متاثر ہو گئے چنانچہ اسی انقلابی اور بحرانی دور کا مرقع "انجم کدہ" کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کام کے انجام دہی میں متعدد اخبارات اور رسائل کے ذریعہ شعرائے کرام کو نظمیں اور غزلیں بھیجنے کی دعوت دی گئی تھی اور اساتذہ کرام کو خطوط بھی لکھے گئے تھے۔ جنھوں نے ازرہ نوازش اپنی ۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں اور غزلیں خود انتخاب فرما کر مرحمت فرمائیں جس کے لئے میں ان سب حضرات کا فرداً فرداً ممنون و شکر گذار ہوں۔

عیب جو اور نقص بیں نگاہیں تو الہامی کتابوں پر بھی نکتہ چینی سے نہیں چوکتیں اور ہر اچھی کتاب مقالہ، نظم اور غزل میں انتقاد یا یوں کہیئے تنقیص کی گنجائش نکال لیتی ہیں اس لئے وہ اس مجموعہ میں بھی خامیاں تلاش کر سکتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ کامیاب نظموں اور غزلوں کا حامل ہے۔ اس میں گمنام شعرا کو جگہ دیکر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی میرا خیال ہی نہیں ایمان ہے کہ اسطرح کی ہمت افزائی سے اردو کی اچھی خدمت ہو سکتی ہے لوگ اور ہر متوجہ ہوتے ہیں مطالعہ کا ذوق بڑھتا ہے جس سے کہ اردو کے نام لیواؤں میں آئے دن ترقی ہوتی جاتی ہے۔

میں نے بمبئی کے تقریباً چار سال کے قیام میں دیکھا ہے کہ صرف مشاعروں کے اتحاد و مذاق نے ہزاروں دوست پیدا کر دیئے یہاں مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں اور لوگ اس میں بکثرت حصہ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بمبئی میں آج اتنے اردو کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبار شایع ہوتے ہیں جتنے دہلی اور لکھنؤ میں ابتک شایع نہ ہوئے ہوں گے۔ اور یہ ذوق دن بدن ترقی کرتا جا رہا ہے۔

اکثر شعراء نے ہر حیثیت سے عمدہ نظمیں اور غزلیں کہیں اپنے

اپنے ملک کی سیاسی اور سماجی بدحالی سے متاثر ہو کر انھیں چیزوں کو نظموں میں پیش کیا ہے قحط، جنگ اور اقتصادی کشمکش کے مختلف پہلوؤں کو ۴۵ء میں کامیاب طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی اس دور میں اس لئے کامیاب رہا کہ یہ دورانسانی کرب و اضطرار کا ایک افسوسناک زمانہ تھا۔ جس میں انسانیت کے ٹھیکیداروں نے بہیمیت اور درندگی کا نام اونچا کر کے دوسری مرتبہ انسانیت کو شکست دی۔

انجم کدہ کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے[1]۔ پہلے حصہ میں غزلیں دوسرے میں نظمیں اور تیسرے حصہ میں شعراء کرام کے مختصر حالات زندگی درج کئے گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ جس پیمانہ پر ہم "انجمکدہ" کو شائع کرنا چاہتے تھے اکثر حضرات کی بے توجہی کاغذی پابندیاں اور کتابت و طباعت کی دشواریوں نے ہمارے اس ارادہ کو پورا نہ ہونے دیا۔ ورنہ یہ مجموعہ جو آج آپ کے پیش نظر ہے جنوری میں آپ کے ہاتھوں میں ہوتا۔ مگر یہ مشکلات یقیناً غیر اختیاری مجبوریاں تھیں جن پر کبھی میں رہ کر کوئی قابو نہیں پا سکتا اس لئے میں خلوص دل کے ساتھ معذرت گذار ہوں اگر کوئی فرو گذاشت اس سلسلہ میں مجھ سے ہو گئی ہو اور مجھے امید ہے کہ معاونین خصوصیت کے ساتھ اسے بدرگذر کر دینگے۔

---

[1] افسوس کہ کتابت کی دشواریوں سے کتاب کے تینوں حصے شائع نہیں ہو سکے شعراء کرام کے مختصر حالات زندگی اور کچھ نظمیں مجبوراً روک لی گئیں۔ (شفیق کوثری)

پیش گفت

نادم سیتاپوری

"اگر شعر آرٹ اور نغمہ ہے" ــــــ تو وقت۔ زمانہ اور موسم کی دلفریب
تفریحات اسے کتنا بلند اور نمایاں کر دیتی ہیں۔ شاید یہی محسوسات تھے جنھوں
نے شاعر کی زندگی کے اوقات کو بہت سے پرکیف لمحات میں تقسیم کر دیا اور
یہی لمحات آج وقت کے چھوٹے چھوٹے سرور آگیں نغمے بن کر ہمارے سمعی
تصورات اور ذہنی تخیلات میں رقصاں و جنباں ہیں۔ "انجمکدہ" بھی
شعر و نغمہ سے بنائی ہوئی ایک ایسی ہی بستی ہے جس میں وقت کے نغمے۔ موسم
کے راگ اور بیسویں صدی کے انقلابی لمحات کی مدوجزر جھومتی۔ مسکراتی
اور اٹھکیلیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ شباب و کیف کی سرمستیاں شعری تصورات
سے چور اور مخمور ہو کر ایک ایسے عالم رنگ و بو کی طرف ہمیں بلاتی ہیں جہاں
ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات ہمیں ایک پیام حیات دینے
کے لئے مضطرب اور بیقرار ہیں۔
مختلف زاویوں اور متضاد نظریات کا یہ رنگا رنگ تسلسل انجم پارہ

کی ایک کہکشانی لڑی ہے جسے عہد حاضرہ کے ندرت پسند اور جدت طراز صاحب قلم "شفیق کوٹی" نے ترتیب دیا ہے۔ شفیق کوٹی خود ایک صاحب طرز کہنے والے ہی نہیں بلکہ ایک اسلوب فکر رکھنے والے سنجیدہ اور باذوق سخن سنج بھی ایک اچھے لکھنے والے بھی اور سب سے زیادہ ایک بہترین نقاد اور مبصر بھی ہیں۔ لیکن "انجم کدہ" کی تدوین میں انھوں نے اپنی پوری ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے شعراء کے حق انتخاب کی آزادی کو پوری طرح برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ کی تمام نظمیں اور غزلیں جہاں ایک طرف شعرائے کرام کے دلی جذبات اور محسوسات فکری کی صحیح آئینہ دار ہیں وہاں دوسری طرف ان کے حق انتخاب میں کوئی تصرف و مداخلت نہیں کی گئی ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کے بلند معیاری ہونے پر کوئی حرف زنی نہیں کیجا سکتی۔ اور یقیناً سارے مجموعہ میں آپ کو شاید ہی کوئی شعر بھرتی کا نظر آئے!

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں "وقتی تعینات" کے ساتھ جو افکار منظوم آجکل پیش کئے جاتے ہیں ان کے پس منظر اکثر و بیشتر زندگی کے وہ نظریات فلسفے اور سیاسی تفریحات ہوتی ہیں جنھیں شعر کہنے والا ایک وقتی "ذوق نگاہی" میں محسوس کرتا ہے اور والہانہ طور پر یہی کیفیات قلب کی گہرائیوں سے

نکل کر شعرستان تخیل کی وادیوں سے گذرتی ہوئی عالم امکان و ماحول میں

آجایا کرتی ہے۔

آج متقدین کے سرمایہ افکار و احساس پر تجزیاتی تبصرے کرنے کے لئے سب سے بڑی دشواری جو محسوس کی جاتی ہے وہ یہی ہے کہ عہد گذشتہ کی تاریخ ہمیں یہ بتانے سے مجبور و معذور ہے کہ میر تقی میر کے "نشتر" کن محسوسات کی تاریخی یادگاریں ... ؛ آیا ان کی تخلیق کا زمانہ میر کا وہ دور حیات ہے جبکہ ان کی شعر کیفیات خزینہ ماحول میں بدل چکی تھیں یا اس لاشعوری عہد انبساط و سکون کا کارنامہ ہیں جسے ایک شاعر حیات کی طرح انھوں نے مکمل کیا تھا۔

غالب کا فلسفہ آج کتنی تاریخی خصوصیات کا حامل ہوتا اگر ہمیں صحیح طور پر یہ معلوم ہوجاتا کہ مرزا کے انقلابی دور حیات کی یہ بدلتی ہوئی تصویریں کن کن پر آشوب زمانوں کی تخلیقی کائنات ہیں ؛ ان کے کلام کا کتنا حصہ سیاسی رجحانات سے متاثر ہے ؛ اور موجودہ اشعار میں کتنا حصہ ان کی خانگی زندگی سے قریب کہا جا سکتا ہے ان کی شاعری پر کہاں تک فارسی ادب اور آرٹ کے تاثرات کا غلبہ ہے اور خود کہاں تک ان میں ارتقائی نشو ونما کے آثار جگمگا رہے ہیں -؟ یہ سب کچھ معلوم

کرنے کے لئے ہم اس لئے بیقرار نہیں کہ ان معلومات کی روشنی میں ہم ایک "آرگس" کی تخریبی تنقید کی بات تازہ کرنا چاہتے ہیں یا ڈاکٹر بجنوری کے الہامی تصورات کا پروپیگنڈہ مقصود ہے! بلکہ یہ سب کچھ اس لئے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم غالب کو اس کے صحیح خد و خال میں دیکھنا چاہتے ہیں جو ایک "خلش" بننے کے باوجود انسان میں سکون کی لہر پیدا کر دیتا ہے۔

"انجمکدہ" میں سب سے اہم خصوصیت جو مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ اس کا دامن تمام پارٹی بندیوں کے گھناؤنے مظاہروں سے پاک و صاف نظر آتا ہے اس کی ترتیب و تدوین میں کسی صوبجاتی تفریق و تعصب کو جگہ نہیں دی گئی اور نہ مجموعی حیثیت سے اسے کسی ادبی ادارہ کے پروپیگنڈہ کا آلہ کار کہا جا سکتا ہے۔ اقطاع ہند کے ہر خیال و ہر پارٹی کے صاحب فکر افراد کو شریک کر کے "شفیق" نے بلند حوصلگی کی ایک اچھی مثال قائم کی ہے اور میرے خیال میں شفیق کی یہی کامیابی بجائے خود ایک بلند شاہکارانہ کاوش ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں!

جلیل مانکپوری

انجام کشمیری

سیماب اکبرآبادی
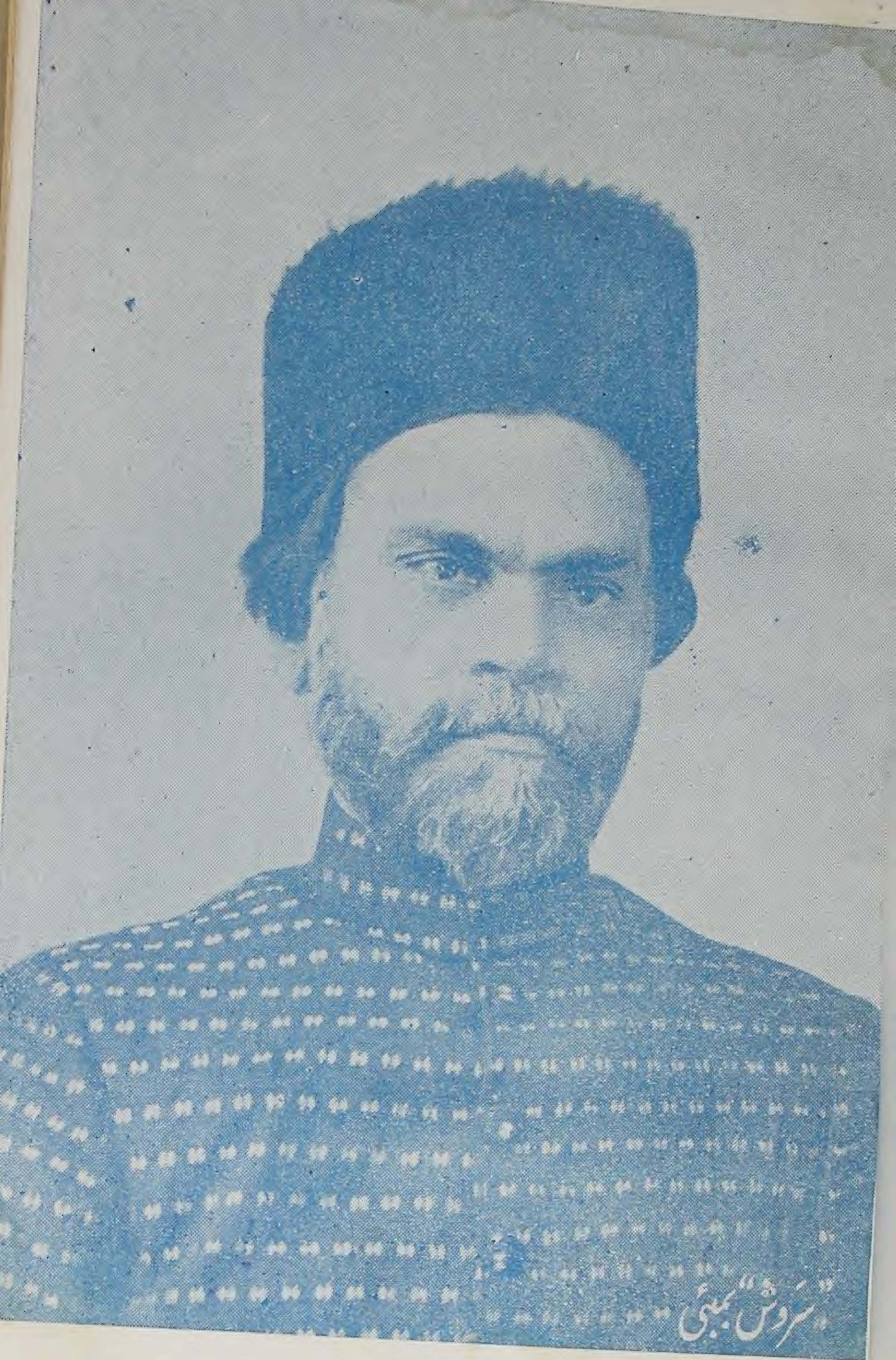
جگر مراد آبادی

آرزو لکھنوي

قمر نعمانی
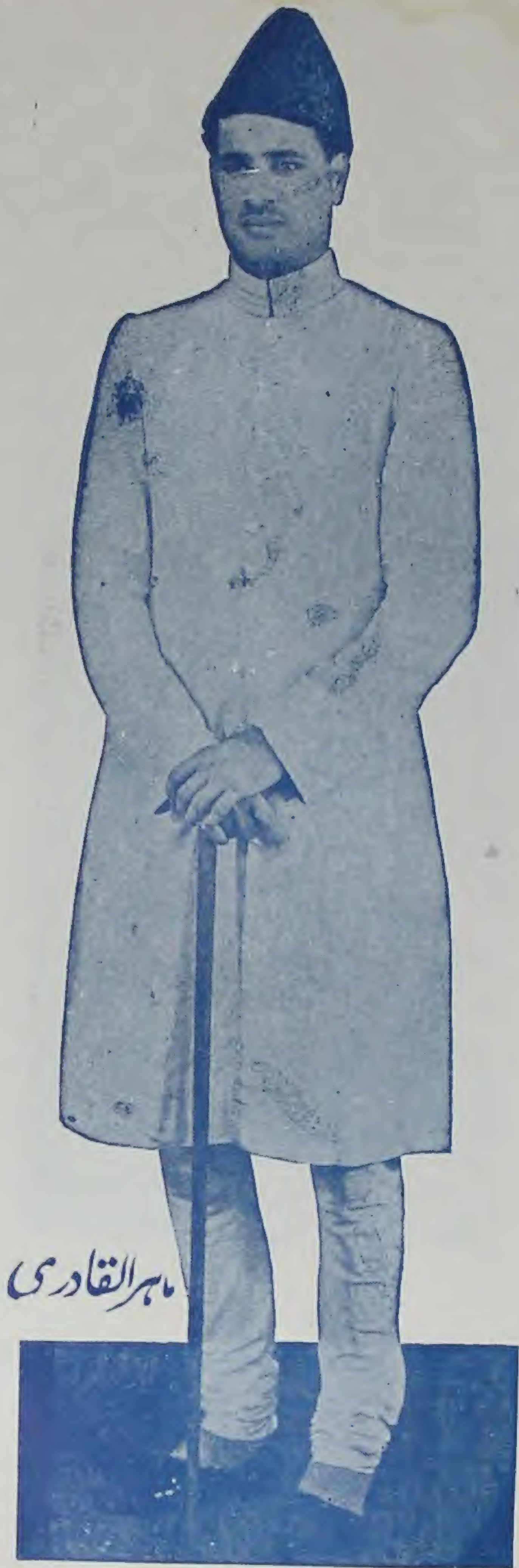
ماہر القادری

سیدہ اختر

باقی اعظمی

اعجاز اکبر آبادی

دیپ

اشرف سرحدي

بہار کوٹی

نشاط امروہو

"بازآیا"

جناب فصاحت جنگ بہادر جلیل مانکپوری مرحوم

عشق دل پر اثر انداز آیا!
میرا ہمدم مرا دمساز آیا

دل لگانے میں بڑا لطف سہی
جائیے جائیے میں باز آیا

اب تو ہر نغمہ یہ دیتا ہے صدا
سازِ ہستی نہ مجھے ساز آیا

گیسوؤں کا وہ ہوا میں اڑنا
حسن لیکر پر پرواز آیا

جھومتے عمر گھٹا کو گذری
میرے ساقی کا نہ انداز آیا

عشق ہے اور غمِ رسوائی
لے کے انجام کو آغاز آیا

وہ تو کیا اس کا تصور بھی جلیل
بصد انداز و بصد ناز آیا

عرش پر ہوں

علامہ سیماب اکبرآبادی

میں یوں راہِ ہستی میں گرمِ سفر ہوں
نظر بر قدم ہوں، قدم بر نظر ہوں
میں پابستۂ دَورِ شام و سحر ہوں
تو پھر کیا بتاؤں کہاں ہوں کدھر ہوں؟
نظر اُس کی نیچی ہے میں بالا نظر ہوں
وہ ہے جلوہ گستر میں جلوہ نگر ہوں
بلندی و پستی مری کچھ نہ پوچھو
کبھی طور پر ہوں، کبھی عرش پر ہوں
پُر از جلوہ ہے صورتِ آئینہ دل
خدا جانے میں کس کے پیشِ نظر ہوں
یہ ہے جبرِ فطرت، کہ دارِ فنا میں
ضروری نہیں میرا ہونا مگر ہوں

بہاریں چمن میں ہیں آزادِ مطلق
نہیں زنداں میں ہوں اور بے بال و پر ہوں
یہ میرے تصور کی گیرائیاں ہیں
کہ چھایا ہوا تیرے احساس پر ہوں
مآلِ جہاں پر کروں تبصرہ کیا
میں انجام سے اپنے خود بیخبر ہوں
ہوائیں حوادث کی گھیرے ہوئے ہیں
میں دُودِ چراغِ سرِ رہ گذر ہوں
نہیں ہوں تو ہونے کا احساس کیوں ہے
مری غایت بود کیا ہے اگر ہوں
نہیں کچھ ہوس ماسوائے تماشا
کہ میں تو سراپا نظر ہی نظر ہوں
مجھے اپنے رستے پہ منزل لگا لے
مسافر ہوں، نووارد رہ گذر ہوں
نہیں کم لحد میں عذاب محبّت
یہاں ابھی اسیرِ شب بے سحر ہوں
جبیں ان کے در سے نہ سیماب اٹھیگی
کہیں سر بہ سجدہ ہوں، سجدہ بسر ہوں

تری آوازِ پا سے ہم

رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی

رکھتے ہیں خضر سے نہ غرض رہنما سے ہم
چلتے ہیں دور بچ کے ہر اک نقشِ پا سے ہم

مانوس ہو چلے ہیں جو دل کی صدا سے ہم
شاید کہ جی اٹھے تری آوازِ پا سے ہم

دل کو عزیز مہر غمِ آسماں بھی تھا مگر
جب تک ملے نہ تجھے غمِ دیر آشنا سے ہم

او محوِ نازِ حسن تجھے کچھ خبر بھی ہے
تجھ پر نثار ہوتے ہیں کس کس ادا سے ہم

تیری صدا سمائی ہے کانوں میں اس طرح
بیگانہ ہو چلے ہیں خود اپنی صدا سے ہم

مخصوص کس کے واسطے ہے رحمت تمام
پوچھیں گے ایک دن یہ کسی پارسا سے ہم

یارب نگاہِ ناز کو دے اور وسعتیں
گھبرا اٹھے جمالِ جہت آشنا سے ہم

تیرِ جو خطا نہ کرے

علامہ آرزو لکھنوی

زور کیا ہے جو وہ وفا نہ کرے | پھول کانٹا بنے خدا نہ کرے

شوق ہے شوق اور حرص ہے حرص | ہم کریں کیوں جو کچھ زمانہ کرے

جان یوں ہی ہے ہر ادا پہ نثار | ہو یقینِ وفا تو کیا نہ کرے

حاصلِ زندگی ہے عشق کا درد | دکھ بڑھاتا رہے دوا نہ کرے

کم ہے چتون پہ اعتماد ابھی | مار وہ تیر جو خطا نہ کرے

ہائے رے اس مریضِ غم کا نصیب | کہ جو دکھ جھیلے اور دوا نہ کرے

دل کو شوق آشنا کرے جو ہوس | آنکھ کو صورت آشنا نہ کرے

حسن مغرور، عشق بھی خوددار | کیا کرے دل غریب کیا نہ کرے

آرزو ہاں یہی ہے عشق کی شان
گھٹ کے مر جائے التجا نہ کرے

پہلی نظر کو میں

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوحؔ ناروی

کیوں رنج و غم اٹھاؤں اٹھا کر نظر کو میں
یعنی جدھر کو وہ ہوں نہ دیکھوں ادھر کو میں

آزار و غم کہ جس میں پھنسا عمر بھر کو میں
کرتا ہوں یاد اس تری پہلی نظر کو میں

پاتا ہوں ہر طرف ترے حسن اثر کو میں
دیکھوں کدھر کو اور نہ دیکھوں کدھر کو میں

سجدوں کا اذن تو نہیں دیتا ہے پاسباں
کرلوں سلام شوق ہی اس سنگِ در کو میں

طولِ شب فراق اجل کا پیام ہے
اے زندگی نہ دیکھ سکوں گا سحر کو میں

دیر و حرم کریں نہ مرا کس لئے وقار
نقشِ قدم پہ ان کے جھکاتا ہوں سر کو میں

تنویر حسنِ یار دکھاتا ہے آفتاب
ہوتا ہوں بیقرار سوا دوپہر کو میں

جب آہ کر کے آہ سے دل نے کیا سوال
آئی صدا کہ ڈھونڈ رہی ہوں اثر کو میں

ملتا نہیں پتہ کہیں عیش و نشاط کا
دوڑا رہا ہوں ہر طرف اپنی نظر کو میں

حسرت سے دیکھتا ہے کبھی چارہ گر مجھے!
حیرت سے دیکھتا ہوں کبھی چارہ گر کو میں

ہر قطرہ ایک بحر ہے ہر ذرہ ایک دشت
لاؤں کہاں سے چشم حقیقت نگر کو میں

موقع جو مل گیا تو ملاؤں گا ایک دن!
اپنے دل و جگر سے پرائی نظر کو میں

بجلی کبھی گرے گی جلانے کے واسطے
کیوں پہلے ہی سے پھونک دوں اپنے گھر کو میں

اب دیکھنا یہ ہے کہ دکھاتا ہے عشق کیا
لیتا ہوں سر کو بیچ کر اس دردِ سر کو میں

وہ دن بھی جلد تر کہیں آئے خدا کرے
محشر میں تم ادھر کو گھڑے ہو ادھر کو میں

تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ لو تم ادب سے کام
کیوں کر لڑاؤں اُن کی نظر سے نظر کو میں

پہلے نگاہ اٹھتی ہے ان کی نگاہ پر !!
کیا کیا سراہتا ہوں پھر اپنے جگر کو میں
اے آرزوئے دشت نوردی خطا معاف
چھوڑے گا گھر نہ مجھکو نہ چھوڑوں گا گھر کو میں
ہنگام صبح شمع یہ کہہ کر ہوئی خموش
آئی تھی بزم دہر میں بس رات بھر کو میں
ایماء ہے بالیقین یہی سیدھی نگاہ کا
رکھ لوں جگر میں آپ کے تیر نظر کو میں
اے ساکنان راہ وفا دو مجھے صلاح!
پلٹوں اگر ادھر سے تو جاؤں کدھر کو میں
یہ جان کر کہ خاک میں ملنا ضرور ہے
چھوڑوں گا جیتے جی نہ تری رہ گذر کو میں
دونوں کا رکھ رکھاؤ محبت میں چاہیئے
دیکھوں جگر کو اپنے کہ ان کی نظر کو میں
یہ کیا کہا۔؟ اگر ہوئی فرصت تو آؤں گا!
سو بار دیکھ بھال چکا اس اگر کو میں
ہر اشک اپنے ساتھ ہے طوفاں لیئے ہوئے
اے نوحؔ آزماؤں گا پھر چشم تر کو میں

زمیں کو آسماں کہیے

حضرت دلؔ شاہجہانپوری

عروجِ عشق کی اہلِ وفا سے داستاں کہیے
جہاں دل مٹ چکا ہے اس زمیں کو آسماں کہیے

مقدر نے تو دنیا ہی بدل دی ہم اسیروں کی
کوئی یہ کہہ رہا ہے اب قفس کو آشیاں کہیے

حقیقت تک پہونچ جانا ہے انجام آشنا ہونا
جو صورت سامنے آئے اسے وہم و گماں کہیے

کیا بیخود مجھے ناکامیٔ عرضِ تمنا نے
مری فریاد کو بیربطیٔ طرزِ فغاں کہیے

کسی کی یاد آتے ہی اب اس عالم میں پہنچا ہوں
مرے اک اک نفس کو زندگیٔ جاوداں کہیے

کمالِ جستجو سمجھا ہوا ہوں دل کی بربادی
مجھے راہِ محبت میں دلیلِ کارواں کہیے

قیامت ہے لبِ ناموس سے اک اُف نکل جانا
یہ ہیں دو حرف لیکن داستاں در داستاں کہیے

نہ آلِ آرزو ہوں سعیٔ لاحاصل کا حاصل ہوں
مری ہستی یہیں تک ہے کہ خاکِ آشیاں کہیے

نظر کا اک اشارہ چاہیے اہلِ محبت کو
جبینِ شوق جھک جائے جدھر کہیے جہاں کہیے

وہ چشمِ عشوہ گر اے دل اگر جانِ تمنا ہے
ترے انجام کو پھر کس نظر کا امتحاں کہیے

فضائے دہر پر چھایا ہوا ہے جوشِ بربادی
سمجھ کر آپ اب ذراتِ دل کو رائیگاں کہیے

جنابِ دل یہی رودادِ ناکامی کا حاصل ہے
جہاں تک سن سکے کوئی وہیں تک داستاں کہیے

عیشِ جاوداں

حضرت وحشتؔ کلکتوی

قفس میں عمر گذری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

ہماری دور بینی سے ہمارے امن کی دشمن
نہ ہوتی فکرِ مستقبل تو عیشِ جاوداں کرتے

پتہ ملتا نہیں جنسِ وفا کا اس زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے

حرم میں بھی جب اپنے ساتھ تھی قسمت کی محرومی
تو ہم کس منہ سے آخر شکوۂ جورِ بتاں کرتے

نہ تھی منظور ہم کو شمع کی تقلیدِ رسوائی
کہ محفل میں بیانِ لذتِ سوزِ نہاں کرتے

ابھی ہیں قوتیں ناآزمودہ حسن و الفت کی
جو تم کھنچتے تو ہم بھی جذبِ دل کا امتحاں کرتے

مزا آتا اگر گذری ہوئی باتوں کا افسانہ!
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

اگر کچھ التفاتِ ناز ہوتا حوصلہ افزا
تو شرحِ آرزو ہم داستاں در داستاں کرتے

قفس میں پر فشانی کا نتیجہ تھا پشیمانی
بجز آہ و فغاں کیا اور ہم سے ناتواں کرتے

دلِ افسردہ کو اپنے جو احساسِ طرب ہوتا
تو ہم بھی دو گھڑی سیرِ بہارِ بوستاں کرتے

نہ پرواہ کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی
بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

ہم اپنے دیدۂ مشتاق ہی سے کام لیتے ہیں
حجاب آتا ہے ان سے آرزوؤں کا بیاں کرتے

ہمیں بے فائدہ تجدیدِ غم کی کیا ضرورت ہے
پس از بربادیٔ گلشن جو یادِ آشیاں کرتے

حرم کیا، دیر کیا، یکساں کشش تھی سارے عالم میں
خدائی جمع ہوتی خود نمائی تم جہاں کرتے

کیا موقوف ہم نے قصۂ دردِ نہانِ وحشت
کہاں تک خامۂ حسرت رقم کو خونچکاں کرتے

تم بھی ہو نظر والے

نواب سراج الدین احمد خان صاحب سائل دہلوی مرحوم

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو ہم کو تم بھی ہو نظر والے

نظر آئیں گے نقشِ پا جہاں اس فتنہ گر والے
چلیں گے سر کے بل رستہ وہاں کے رہگذر والے

صنم ایجادیوں کی شان میں بٹہ نہ آ جائے
نہ کرنا بھول کر تم جورِ چرخِ کینہ ور والے

جفا و جورِ گلچیں سے چمن ماتم کدہ سا ہے
پھڑکتے ہیں قفس کی طرح آزادی میں پر والے

الف سے تا بہ یا اللہ افسانہ سنا دیجے
جنابِ موسیٰ عمراں وہی حیرت نگر والے

ہمیں معلوم ہے ہم مانتے ہیں ہم نے دیکھا ہے
دلِ آزردہ ہوا کرتے ہیں از حد چشمِ تر والے

کٹانے کو گلا آٹھوں پہر موجود رہتے تھے
وہ دل والے جگر والے سبھی ہم بھی ہیں سر والے

تماشا دیکھ کر دنیا کا سائل کو ہوئی حیرت
کہ تکتے رہ گئے بدگوہروں کا منہ گہر والے

میں آنکھ چُرا بھی نہ سکوں

وحید العصر حضرت حاجی سید منشی وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی

رازِ الفت تو نہیں غم کہ سُنا بھی نہ سکوں
غش بھی کیا موت ہے جو ہوش میں آ بھی نہ سکوں

عشق وہ غم کہ چھپاؤں تو چھپا بھی نہ سکوں
تو وہ بدظن کہ جتاؤں تو جتا بھی نہ سکوں

نقشِ پا دیکھ تو لوں، لاکھ کروں گا سجدے
سر مِرا عرش نہیں ہے کہ جھکا بھی نہ سکوں

بیوفا لکھتے ہیں وہ اپنے قلم سے مجھ کو!
یہ وہ قسمت کا ہے لکھا کہ مٹا بھی نہ سکوں

غیر کے سر کی قسم میری بلا کھاتی ہے
زہر وہ دیتے ہیں مجھکو جسے کھا بھی نہ سکوں

ایسی بگڑی ہوئی قسمت بھی کسی کی ہوگی!
وہ بگڑ جائیں تو میں ان کو منا بھی نہ سکوں

کیا کروں پاسِ محبت نے گلا گھونٹا ہے
آپ سب کچھ کہیں میں ہونٹ ہلا بھی نہ سکوں

اس کا قبضہ میرے دل پر ہے زباں پر قابو!
رازِ دل اس سے چھپاؤں تو چھپا بھی نہ سکوں

دل نے لیجا کے وہاں تجھکو پھنسایا کہ جہاں!
آپ جا بھی نہ سکوں اسکو بلا بھی نہ سکوں

کہ کے اک بات مجھے حکم دیا ظالم نے
دل میں رہنے بھی نہ دوں دل سے بھلا بھی نہ سکوں

عرض مطلب پہ تیری ہاں نے کہا یہ مجھ سے
وہ خوشی ہوں کہ ترے دل میں سما بھی نہ سکوں

خاک میں کیوں نہ ملاؤں اسے دل ہے میرا
نقشِ پا تو نہیں تیرا کہ مٹا بھی نہ سکوں

دل میں ہے آگ بھری آنکھ میں آنسو نہ رہے
بھڑک اٹھے کوئی شعلہ تو بجھا بھی نہ سکوں!

یہ ڈھٹائی یہ مروت کہیں دیکھی نہ سنی!
دل چرا لے کوئی میں آنکھ چرا بھی نہ سکوں

آج سچ مچ مجھے بیخود ہی بنا دے ساقی
تیز اتنی ہو کہ پھر ہوش میں آ بھی نہ سکوں

غزل

کچھ اس انداز سے بہار آئی
ہو گئے مہر و مہ تماشائی — غالب

(حضرت فراق گورکھپوری)

یہ سہانی اداس تنہائی
لیتی ہے پچھلی رات انگڑائی

پیکرِ نازنیں کی انگڑائی
ماہِ نو نے کمان لچکائی

نیند آئی تجھے کہ کھولکے بال
شب کی دیوی نے انگلی چٹکائی

عالمِ خواب، ناز، ماتھے پر
چھاؤں تاروں کی جب سرک آئی

بزم تھی لرزشِ خفی کی موج
اس ادا سے وہ آنکھ شرمائی

بات کہنے کی ہے کہ موت نے بھی
اِن نگاہوں سے زندگی پائی

دے اٹھی لو فضائے نرم اے دوست
مسکراہٹ تری جو یاد آئی

درمیاں تھے ابھی بہت پردے
ہوگئی دور دور رسوائی

یوں مٹایا غم والم تو نے
شادمانی کی آنکھ بھر آئی

الٹی سانسیں بھی لے چکا ہے عشق
تیرے ہونٹوں کی وہ مسیحائی

اب تو یادِ دلِ حزیں کیلئے — اک کہانی ہے تیری رعنائی
اب کسے کوئی شادکام کرے — وہ تمنا نہ وہ تمنائی
یہ رسائی تو دیکھ موت سے بھی — عشق کی دوستی نکل آئی
صبحِ فرقت نہ اٹھس غم کو جگا — رو چکے رات بھر تو نیند آئی
تھاہ دیتی نہیں پتال کو بھی — عشق کی زندگی کی گھبرائی
یوں تو دو ہاتھ کی ہے کاکلِ ناز — حد نہیں رکھتی اس کی گہرائی
اُبلی پڑتی ہے خار و خس سے حیات — کشتِ ہستی کی دیکھ پیدائی
جیسے ذوقِ گناہ وجد میں آئے — اس ادا سے وہ زلف لہرائی
رمزِ مانوسیت کی ہے تصویر — مجھ سے کم کم تری شناسائی
خود ترا درد جیسے چونک اٹھے — آج کس وقت تیری یاد آئی
شبِ غم کو تری جھلک نہ ملی — تاروں نے بھی نگاہ دوڑائی
ارے اس سے تو موت ہی آجائے — زندگی زندگی سے باز آئی!
ہائے جب بے صدا نگاہوں نے — شوق کی داستان دُہرائی
تو نے جانا مجھے بھی زندوں میں — اے مری موت تو کدھر آئی
یک بہ یک لہلہا اٹھی ہے فضا — وہ گلابی نظر نے چھلکائی

میں نے چھیڑی فراقؔ جب یہ غزل
عشق کے دل کی چوٹ اُبھر آئی

کاروانِ جنوں

حضرت احسان دانش

ہر شے پہ نگاہیں رکتی ہیں ہر چیز میں ڈوبا جاتا ہوں
اظہارِ حقیقت خاک کروں ماحول مخالف پاتا ہوں

کیا جانے مذاقِ فطرت ہے یا جرم ہے خود انسانوں کا
مجبورِ بہر عنوان ہوں میں مختار مگر کہلاتا ہوں

آغازِ پریشاں حالی میں اک دور تھا شب بیداری کا
گرداب میں اب نیند آتی ہے طوفان میں آ سو جاتا ہوں

دن بھر کا گذشتہ ہنگامہ جب شام کو دل دہراتا ہے
اپنی ہی نظر کی خامی کو غیروں کی خطا ٹھہراتا ہوں

کیا جانے جنوں کے ساتھ یونہی جانا ہے ابھی کس منزل تک
اک راہ کو طے کر لیتا ہوں اک راہ میں گم ہو جاتا ہوں

احسان نظر سے پوشیدہ رہتی ہے عمل کی کوتاہی
تدبیر کو ناقص کہہ کہہ کر تقدیر سے دل بہلاتا ہوں

سرودِ مستانہ

حضرت ماہر القادری

مجھے فریب نہ دے او نشاطِ میخانہ
میں سُن رہا ہوں صدائے شکستِ پیمانہ
جہاں جنوں سے بھی ہے چشمکِ حریفانہ
گذر رہا ہے اب اُن منزلوں سے دیوانہ
نہ آرزوئے بہاراں نہ خوفِ دورِ خزاں
نہ جانے کس نے رکھی تھی بنائے ویرانہ
صنم کدوں کے پُجاری ہیں مسجدوں کے امام
حرم کے بھیس میں ہے پھر فروغ بُت خانہ
گدازِ شمع سے واقف نہ سوزِ غم کی خبر
اُلجھ رہا ہے ابھی روشنی سے پروانہ
کوئی سُنے نہ سُنے میں سُنائے جاتا ہوں
مرا کلام ہے ماہر سرودِ مستانہ

ترے واسطے بیتاب!

(حضرت جاں نثار اختر)

اب جوششِ طوفاں ہے نہ وہ شورشِ سیلاب
دریائے محبّت تو نہ تھا جوئے تنک آب

ہر سانس پہ ٹوٹے ہوئے تاروں کی صدائیں
اب سازِ مرے دل کا نہیں تشنۂ مضراب

یا تیری محبّت کی کبھی پیاس تھی مجھکو
یا آج اُسی پیاس سے ہے دل مرا سیراب

آنکھوں میں نہ حسرت ہے نہ بانہوں میں حرارت
اک دل ہے جو اب بھی ہے ترے واسطے بیتاب

طوفان میں ساحل کی طرف موڑ نہ کشتی
ساحل ہی سے ٹکرا کے جو گذرا کوئی سیلاب

یا کتنے تبسّم تھے ترے اشک میں اختر
یا آج تجھے ایک تبسّم کی نہیں تاب

۳۶

شمعِ کشتہ

(حضرت الم مظفر نگری)

کہیے کس رنگ سے دل عشق کا دیوانہ بنے
باعثِ گرمیٔ محفل پئے پروانہ بنے
سر بسر مصلحتِ وقت سے بیگانہ بنے
ظرف اس قطرۂ ناچیز کا دیکھے تو کوئی
محفلِ شوق کو برہم نہ ابھی ہونے دو
ٹوٹ کے جڑ نہ سکے گا یہ مرا دل ساقی
غرق ہو ہو کے کئی بار ابھرے ہیں لیکن
کعبہ و دیر مجھے راس نہ آئے ہیں کبھی
ضبطِ اسرار کا یہ حکم ہے بعدِ منصور
دل ہی اک لفظ مگر کوئی اسے کیا جانے
جن کے سینوں میں ازل سے تھا نہاں رازِ جنوں
ذوقِ وحشت میں وہی آکے دیوانے بنے

شمع بنجائے سرِ بزم کہ پروانہ بنے
رونقِ بزمِ وفا شمع بنے یا نہ بنے
اس سے پہلے کہ کوئی آپ کا دیوانہ بنے
عین دریا ہو مگر صورتِ دریا نہ بنے
شمعِ کشتہ سے بھی شاید کوئی پروانہ بنے
غیر ممکن ہے کہ ٹوٹا ہوا پیمانہ بنے
پھر بھی ہم راز شناسِ تہِ دریا نہ بنے
میری خاطر تو نیا کوئی صنم خانہ بنے
اب کوئی آگے سرِ دارِ تماشا نہ بنے
دونوں عالم اسی عنوان کا افسانہ بنے
وہ کہیں بھی نہ مگر وقت پہ دیوانہ بنے
پھر چمن از سرِ نو صورتِ ویرانہ بنے

وسعتیں ہیں یہ فقط میری کہانی میں الم
کیجیے شرح تو ہر لفظ اک افسانہ بنے

"غمِ فراق"

(زہرۂ سخن خطیبۂ ہند سیدہ اختر صاحبہ)

حسن غمِ فراق پہ الزام آگیا
لب پر غضب ہوا کہ ترا نام آگیا

میں کیا کہوں؟ گواہ ہیں میری محبتیں
جب گہری سانس لی ترا پیغام آگیا

پھر روئے تابناک پہ زلفِ سیاہ ہے
پھر آج دامِ کفر میں اسلام آگیا

اے طالبانِ دید! تمہاری نظر کی خیر
اک حسنِ بے پناہ لبِ بام آگیا

تم نے اٹھایا عارضِ رنگیں سے کیا نقاب
گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا

حاصل ہوئی ہیں عشق کو کیا کیا مسرتیں
اُس بزم سے جو دل بھی کبھی ناکام آگیا

بیٹھی ہوئی ہوں خاک بسر تیرے در پہ میں
اب وقت جاں نثاریِ خدام آگیا

کہتے ہیں جس کو عشق، ترے حسن کو نوید!
وہ طائرِ حسین بھی تہِ دام آگیا

ہم نے بہ فرطِ شوق، گوارا کیا سکوت
محفل کی جب زباں پہ ترا نام آگیا

اختر یہ میرے شعر نہیں ہیں بہ فیضِ عشق
جیسے کہ ہر نفس کو کوئی الہام آگیا

سوزِ پنہاں

(حضرت اعجاز صدیقی)

نہ جا اس کے ارمان اور آرزو کی سحرِ شام اسطرح شمعیں بجھا کر
تجھے جس نے برسوں میں اپنا بنایا، جوانی ہی کیا ساری دنیا لٹا کر

وہ یوں بھول بیٹھے ہیں اپنا بنا کر، محبت کی اک آگ دل میں لگا کر
کہ جیسے سفینہ کوئی پیچ کھا کر، ہو غرقاب نزدیک ساحل کے آ کر

بہت کوششیں کیں کہ ان کو بھلائیں، وہ روٹھے ہیں ہم بھی نہ کیوں روٹھ جائیں
مگر دل کی مجبوریاں کیا بتائیں، کہ لانا پڑا خود ہی ان کو منا کر

انہیں مجھ سے شکوہ نہ کوئی شکایت، مرے جرم پر اور الٹی ندامت
یہ پیہم نوازش، مسلسل عنایت، خدا جانے چھوڑیں مجھے کیا بنا کر

دعا کا بھی حامی، اثر کا بھی قائل، جراحت رسیدہ بھی گو ہے مرا دل
مگر کوئی یہ تو بتائے کہ مانگوں میں اس دینے والے سے کیا ہاتھ اٹھا کر

اسی طرح پھوٹیں، اسی طرح چمکیں امید و تمنا کی کرنیں دلِ غمزدہ میں
اندھیروں میں رہ جائیں جیسے فلک پر ستارے سے کچھ جھلملا جھلملا کر

بڑا فرق ہے رسم اور بندگی میں، کوئی بت ہو پیشِ نظر یا خدا ہو
وہ سجدہ کی لذت سے کیا آشنا ہو، اٹھا لے جو ہر بار سر کو جھکا کر

تری عشوہ کاری کے قربان جاؤں، کہ حسن و ادا کا کرشمہ دکھایا
ہزاروں طرح مجھکو وحشی بنایا، کبھی گنگنا کر، کبھی مسکرا کر

وہ آنکھ سے موتیوں کی سی لڑیاں، ہو جسطرح ساون بھادوں کی جھڑیاں
وہ کاش آ کے دیکھیں یہ پر سوز گھڑیاں کہ بیٹھا ہوں تاروں کی محفل سجا کر

بہت انکے جلووں سے نظریں بچائیں بہت انکی مخمور ادائیں بھلائیں
مگر پھر بھی دیکھے قریب ایک کانٹا سا رہ ہی گیا مستقل چبھ چبھا کر

یہ آہیں یہ نالے، یہ آرزدہ کاری، نہیں ہیں یہ تجھکو خوشی کی بھکاری
مسرت میں جب عمر اپنی گذاری تو غم کی بھی دن کاٹ دی مسکرا کر

یہ سوز دروں وفا کیا بلا ہے، کھلے اور نہ بہے یہ کیسی گھٹا ہے
ان آنکھوں سے پوچھو جو دل کی دھوئیں سے بھریں اور پھر رہ گئیں ڈبڈبا کر

اٹھا ایک طوفان رگ رگ سے اپنی اور اس میں سفینے کو دل کی ڈبو دے
کہیں بوجھ دیوانے ہوتا ہے ہلکا غم و رنج میں چند آنسو بہا کر

ہر اک پنکھڑی ہی یہاں خون دامن، ہے پیوست اک خار ہر قلب گل میں
کہاں تک چلینگا کہاں تک چلیگا، گلستاں میں کانٹوں سے دامن بچا کر

بہت درد آگیں ہے اپنی کہانی ہے شعروں میں ہلکا سا سوز نہانی
گذاری ہے اعجاز ہم نے جوانی، بہت رنج سہہ کر بڑے دکھ اٹھا کر

حیات میں انتشار سا ہے!

(حضرت نہالؔ سیوہاروی)

بہار کا روپ بھی لگا ہو نہیں اک فریبِ بہار سا ہے
حیات میں دل کشی نہیں ہو، حیات میں انتشار سا ہے

زمانہ کیا دیکھیے دکھائے، نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور ہیں خشمگیں سی زمیں کے دل میں غبار سا ہے

کمالِ دیوانگی تو جب ہے رہے نہ احساسِ جیب و دامن
اگر ہے احساسِ جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

کچھ آج ایسی ہی جی میں گذری، دبی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
جسے سنبھالے ہوئے تھا دل میں وہ نالہ بے اختیار سا ہے

نہ پوچھ عالم مرے چمن کا، نہیں نشاں تک گل و سمن کا
کبھی جو فردوسِ رنگ و بو تھا وہ ایک اجڑا دیار سا ہے

ابھی امید وفا نہ توڑو، سیاستِ دلبری نہ چھوڑو
ابھی کہاں نا امید ہوں میں، ابھی مجھے اعتبار سا ہے

نہالؔ کو بے پیے ہی مستی، ہے مفت الزامِ مے پرستی
ہے عام اس شہر میں روایت یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

”طوفان نہ رکیگا“

(حضرت بہار کوٹی)

وحشی ہے یہ وحشی سرِ زنداں نہ رُکے گا
زنجیر سے باندھا ہوا طوفاں نہ رُکے گا

کہدے کوئی زنداں کے محافظ سے یہ جاکر!
اِس تودۂ خاشاک سے طوفاں نہ رکے گا

ظلمات سے ایماں کی کرن پھوٹ پڑے گی
پردوں سے یہ خورشید درخشاں نہ رکے گا

اے دوست تعطّل نہیں فطرت میں جنوں کی
گر ہاتھ رُکا بھی تو، گریباں نہ رکے گا

پنہاں رہے اندوہِ غلامی نہیں ممکن
کیا ایک بھی آنسو سرِ مژگاں نہ رکے گا

تا چند یہ ہنگامۂ نیرنگ سیاست
آندھی میں چراغِ تہِ داماں نہ رکے گا

مغرب کی سیاست ہو کہ مشرق کی قیادت
سیلاب کی زد میں کوئی ایواں نہ رکے گا

آنچ آنہ سکے

(حضرت خمار بارہ بنکوی)

غمِ نہاں کو بھلایا، مگر بھلا نہ سکے
لبوں کو چھیڑ لیا دل سے مسکرا نہ سکے
کچھ ایسی نیند ترے غم کی چھاؤں میں آئی
کہ حادثاتِ زمانہ ہمیں جگا نہ سکے
چمک چمک کے ہزار آفتاب ڈوب گئے
ہم اپنی شامِ الم کو سحر بنا نہ سکے
مجھے تو ان کی عبادت پہ رحم آتا ہے
جبیں کے ساتھ جو سجدے میں دل جھکا نہ سکے
اگر ہزار نشیمن جلیں تو فکر نہ کر!
یہ فکر کر کہ گلستاں پہ آنچ آنہ سکے
گذر گیا کبھی ایسا بھی وقتِ مجبوری
کہ ہم بھی رو نہ سکے وہ بھی مسکرا نہ سکے
ہزار بار ہوئے خوش بھلا کے ہم اُن کو
مزا تو یہ ہے کہ اک بار بھی بھلا نہ سکے
خمار اجل بھی نہ راس آئی اُن غریبوں کو
جو زندگی کو حریفِ اجل بنا نہ سکے

ہجومِ یاس

(حضرت عزیز احمد عزیزؔ)

شام و سحر جو یاد انھیں آ رہا ہوں میں! | کتنی بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

ہر بات منہ سے نکلی ہوئی بن رہی ہے پھول | اپنی زباں پہ نام ترا لا رہا ہوں میں

وہ کیا گئے، بہار گئی، زندگی گئی! | یہ جانتے ہوئے بھی جیئے جا رہا ہوں میں

مینا بدوش حسن ہے ساغر بکف نظر | اے زندگی سنبھال گرا جا رہا ہوں میں

دے دیکھ التفاتِ محبّت کا واسطہ | اب کیوں ہجومِ یاس سی گھبرا رہا ہوں میں

کس کو نصیب تیری نگاہِ کرم نواز! | اب تو تمام درد ہوا جا رہا ہوں میں

قربِ حبیب تو نہیں اندیشۂ ملال | پروانہ وار آپ جلا جا رہا ہوں میں

دل بیقرار، ہوش پراگندہ، جاں تباہ | کس جرمِ ناروا کی سزا پا رہا ہوں میں

جب سے کسی نے یاد کیا ہے مجھے عزیزؔ
بدلی ہوئی جہاں کی فضا پا رہا ہوں میں

موت کا سودا کون کرے

(حضرت علی احمد علی)

یہ مانا حسن ہے بے پردہ پر اُس کا نظارہ کون کرے
یعنی اپنی زیست کے بدلے موت کا سودا کون کرے

جینے کا سہارا ہے یہ خلش، رہنے دو اسے اے چارہ گرو
جس درد میں لذت ملتی ہو اس درد کو اچھا کون کرے

ہر سانس میں ماتم کی بو ہے ہر آس بھی یاس آلودہ ہے
جب نام اسی کا جینا ہے جینے کی تمنا کون کرے

حال اس بیدل کا کیا کہیے توہین تمنا کیوں کیجے
تقدیر تو اپنے بس کی نہیں تدبیر کو رسوا کون کرے

کلیاں جو ہنسیں کلیاں نہ رہیں اور گل جو ہنسے برباد ہوئے
جب ہنسنے کا انجام یہ ہو ہنسنے کا ارادہ کون کرے

یہ بہکی فضا یہ مست گھٹا یہ بادِ صبا کے نرم جھونکے
اور اُف یہ پینے کا موسم پینے سے توبا کون کرے

ہیں بحرِ کرم کی زد میں ہوں امید کا لنگر کیوں توڑوں
ہو مدِ نظر میں جب ساحل غرقاب سفینا کون کرے

میخانہ ہے اپنا تو دور میں ہوں انجام کی فکرِ خام کسے
امروز سے یاں فرصت ہی نہیں اندیشۂ فردا کون کرے

ہوں مستِ مئے مینائے علی کیا حاجت مجھکو پینے کی
ساقی کے آگے کون جھکے، ساغر کو سجدا کون کرے

"آمالِ رنگین"

(حضرت سراج الحسن سراج لکھنوی)

تو خود ہی فطرت کے نقش کامل تمہیں ہم آئینہ کیا دکھائیں!
ہمارے سجدے پہ منحصر ہے تو آؤ تم کو خدا بنائیں

کبھی جو سوکھے بھی دیدۂ تر، تو جی میں آیا کہ مسکرائیں
مگر ہماری خوشی خوشی کیا، پرائے بس میں ہیں کیا بتائیں

ہم اپنی دھن میں تم اپنی دھن میں جو آس دو ساز دل ملائیں
یہی محبت کی زندگی ہے بگڑتے جاؤ مناتے جائیں

بتا کلیجے میں رکھ لیں تجھکو کہ جھک کے سجدے میں سر جھکائیں
تجھے ترے کافِ محبت، خدا بنائیں کہ دل بنائیں

اکیلی راتیں اداس منظر، یہ ٹھنڈی سانسیں یہ گرم آنسو
کوئی نہیں ہے تو یادِ ماضی پر آ تجھی کو گلے لگائیں

فریبِ بیداریٔ تمنا، ہے ایک رنگین خوابِ نوشیں
نہ جانے تعبیر کیا ہو اس کی خوشی منائیں کہ غم منائیں

لطیف مبحث، سوالِ نازک، جوابِ دلکش، تامّل رنگیں
اِدھر ہم ان کو بنائیں قاتل، اُدھر وہ جینا ہمیں سکھائیں

لبوں پہ خشکی، نظر میں حسرت، جو بات تھی ترجمانِ دل تھی
اسی تکلف میں رہ گئے ہم، وہ حال پوچھیں تو ہم بتائیں!

بڑھا کے لو اور تیز کرلیں سراج اپنی ہی روشنی کو
نہ جلوہ ہے اور نہ جلوہ گر ہے کسے متاعِ نظر دکھائیں

نوائے راز

(حضرت راز چاندپوری)

وہ میکشِ خوددار جو مغرور نہیں ہے
میخانۂ عرفاں سے بہت دور نہیں ہے

منظور ہے کیا اور ابھی مشتاق بنانا
یا جلوہ دکھانے ہی کا دستور نہیں ہے

اے طالبِ دیدار بڑی بات ہے یہ بھی
دیوانہ بنانا تجھے منظور نہیں ہے

فریاد کی طاقت ہے، مگر حاصلِ فریاد
فریاد کو سننے پہ وہ مجبور نہیں ہے

شکوہ ہو جفا کا کہ تقاضا ہو وفا کا
اربابِ محبت کا یہ دستور نہیں ہے

اک شورِ انا الحق ہے بپا بزمِ جہاں میں
لیکن کوئی اس عہد میں منصور نہیں ہے

گستاخ ہوں بیباک بھی، کمظرف ہوں لیکن
ساقی کی شکایت مجھے منظور نہیں ہے

یہ دور ہے کیا دورِ خراباتِ جہاں میں
صہبائے وفا سے کوئی مخمور نہیں ہے

بے رنگ ہیں، بےکیف ہیں دنیا کے مناظر
شاید دلِ ناکام ہی مسرور نہیں ہے

کس فکر میں بیٹھا ہے یہاں رہبرِ خوش گام
اٹھ منزلِ مقصود بہت دور نہیں ہے

مشکل نہیں بگڑی ہوئی قسمت کا بنانا
تو صاحبِ مقدور ہے مجبور نہیں ہے

یہ صبر و توکل تو بڑی چیز ہے لیکن
اس میکدے میں دورِ کا دستور نہیں ہے

اچھا تو چلو راز بلاکش سے ملیں گے
کچھ ایسا بہت دور جبل پور نہیں ہے

جہانِ وفا!

(حضرت شفق صاحب)

سکوں بغیر مجھے آج اضطراب نہیں
کہیں جہانِ وفا میں تو اضطراب نہیں
ہوس کو تکملۂ عشق جاننے والے
جہاں ہوس ہے وہاں عشق کامیاب نہیں
مذاقِ دید میں اصلاح میری کام آئی
اب انجمن میں کہیں بدعتِ نقاب نہیں
کہیں غبار، کہیں گردِ رہ، کہیں آندھی!
مری طرح بھی جہاں میں کوئی خراب نہیں
مقامِ حسن سے میرا مقام آگے ہے
وہ جلوہ ہوں جو پسِ پردۂ حجاب نہیں
نہ جانے کونسی منزل ہے یہ محبت کی
کہ دل کا درد بھی اب وجہِ اضطراب نہیں
شفق سے یوں مجھے انکارِ مے کشی ہے شفق
کہ اُن کے ہاتھ میں یہ ساغرِ شراب نہیں

زندگی کا گیت

(حضرت شاعر لکھنوی)

آرزو ہونٹوں پہ آکر رہ گئی!
زندگی اک گیت گا کر رہ گئی

آگیا ان کی جبیں پر بھی عرق
گل پہ شبنم تھرتھرا کر رہ گئی

چھپ گئی رخ پر وہ ہلکا سا حجاب
چاند پر بدلی سی چھا کر رہ گئی

اللہ اللہ وہ نگاہِ شرمگیں
خود ندامت سر جھکا کر رہ گئی

ہے شکست دل کا اک عکسِ لطیف
وہ کلی جو مسکرا کر رہ گئی

ختم پروانے کا ماتم ہو گیا
شمع کی لو تھرتھرا کر رہ گئی

اور کیا شاعرؔ ہو ان کا انتظار!
روح تک آنکھوں میں آکر رہ گئی

۵۰

فصلِ بہار سے

(حضرت افقرؔ موہانی وارثی)

حاصل ہوا ہے یہ چمنِ روزگار سے
کچھ دن ملے خزاں سے تو کچھ دن بہار سے
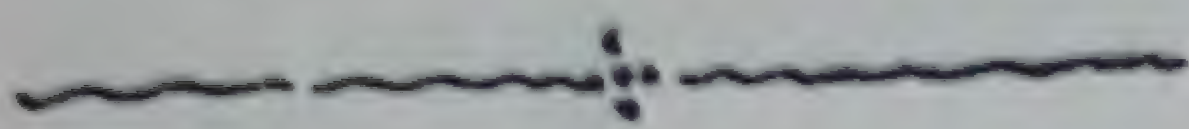
دوہری ہیں مستیاں مری ہر بادہ خوار سے
کچھ جامِ مے سے پیتا ہوں کچھ چشمِ یار سے

خونِ شہیدِ ناز نہ کیوں پھر کھلائے گل
ملتا ہوا یہ رنگ ہے فصلِ بہار سے

فرطِ تجلیات سے کچھ سوجھتا نہیں
خیرہ نظر ہے جلوۂ رخسارِ یار سے

اُن سے مرے نصیب کا چکر بنا دیا
کچھ گردشیں جو بچ رہیں لیل و نہار سے

دورِ فرنگی ہے دھوم تقاضا اجل کا پھر
ہم باز آئے زندگیٔ مستعار سے

لا سکی پھر تو رنگ ہماری بھی داستاں
کچھ سرخیاں جو مل گئیں تصویرِ یار سے

ہوگی کسی کی قبر وہ میری لحد نہیں
بوئے وفا نہ آئے جو خاکِ مزار سے

جلوے ہی جلوے اب تو نظر میں ہیں چار سو
ہم آئینے میں جلوہ گہِ حسنِ یار سے

طاؤسِ سبز پوشِ قیامت اگر ہے ایک
گلگوں قبائے حشر ہو اک حکمِ یار سے

ذرے جہاں کی خاک کے ہیں عرشِ آستاں
افقرؔ ملا ہے ہم کو شرف اس دیار سے

۵۱
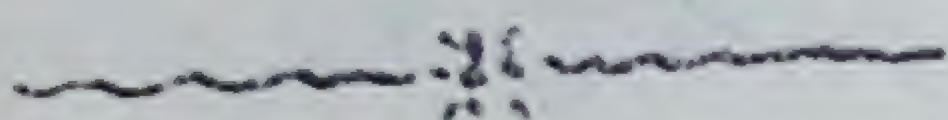
"آگ بجھانے آئے ہیں"

(حضرت احسن رضوی داناپوری)

گھر پھونک تماشا دیکھ چکے اب اشک بہانے آئے ہیں
یا آگ لگائی تھی دل میں یا آگ بجھانے آئے ھیں

جب ایک نظر کی لغزش پر تقدیر کے کھیل بگاڑے تھے
اب ایک نظر کے صدقے میں تقدیر بنانے آئے ہیں

وہ دل کی چوری کیا کہیے ان آنکھوں دیکھی چوری تھی
اب صبر و سکوں کا سرمایہ ہم آپ لٹانے آئے ہیں

غم سہنا یوں بھی سہل نہیں غمخواری دہری آفت ہے
دل خود ہی بھر بھر آتا تھا، کیوں آپ رلانے آئے ہیں

جھپکی جو پلک دن بیت گیا اب یاد کیے کیا ہوتا ہے
دنیا کی ہوا کب پلٹی ہے کب گذرے زمانے آئے ہیں

بیدرد جو ایسے ہوتے تو کیوں درد کے نام سے چونک اٹھتے
وہ غافل مجھ سے کیا ہے تنگ غفلت سی جتاتے آئے ہیں

اس وادیٔ ہستی میں احسن ہر سانس بگولا ہوتی ہے
ہم آندھی بنکر اس بن میں بس خاک اڑانے آئے ہیں

پُر کیف اضطراب

(حضرت صابر دہلوی)

ہر ہر قدم پہ دیکھتا ہوں پاسبانِ دل
لُٹ جائے راہ میں نہ کہیں کاروانِ دل

جب دل نہیں تو کیسے سناؤں بیانِ دل
افسوس دل کے ساتھ گئی داستانِ دل

بالکل وہی تڑپ، وہی پُر کیف اضطراب
اب ان کی یاد پھر بھی ہے مجھکو گمانِ دل

اس کی طلب نے مجھکو مٹایا جہان سے
جسکو سمجھ رہا تھا میں روح وروانِ دل

جب ہم نہیں رہے تو ہماری تلاش ہے
دل مٹ گیا تو آپ ہوئے قدردانِ دل

افسوس آج صابرِ ناشاد ہی نہیں!
ورنہ زباں سے اپنی سُناتا بیانِ دل

آگ سی لگادی ہے

حضرت ضیاؔ فتح آبادی ایم۔ اے

خوبصورت فریب شادی ہے
ہوش کی آرزو مٹادی ہے

اُن کو اپنا سکوں گا میں کہ نہیں
عمر اسی فکر میں گنوا دی ہے

ہم نے چھیڑا ہے جب بھی سازِ جنوں!
تیرگی شب کی گنگنا دی ہے

حُسن اب احترامِ عشق کرے
عِشق نے حُسن کو جِلادی ہے

اے زمیں ہم نے تیرے قدموں پر
آسماں کی جبیں جھکا دی ہے

کوششِ امن تو بجا ہے مگر
آدمی فطرتاً فسادی ہے

اے ضیاؔ قلبِ عشق پرور میں
حُسن نے آگ سی لگا دی ہے

آرام ہوا

(حضرت مہر نظامی سیمابی میرٹھی)

چارۂ دردِ نہاں نزع کا ہنگام ہوا
اپنے مرکز ہی پہ آ کر مجھے آرام ہوا

ہر قدم پر مری منزل نے کیا استقبال
جب ترا لطف و کرم مجھ پہ بہ ہر گام ہوا

فکرِ فردا، غمِ امروز، غمِ موت و حیات
آدمی کیا ہوا مجموعۂ آلام ہوا

غایت اندیشی پہ حیراں تھے سرفشانِ حیات
جب میں آغاز میں نالہ کشِ انجام ہوا

مظہرِ حسن کی صد رنگ فراوانی سے
آدمی اور بھی سرگشتۂ اوہام ہوا

طورِ موسیٰؑ، حرمِ دل، چمنستانِ خلیلؑ
حسن ان خاص حجابوں سے بھی کچھ عام ہوا

شعر بن کر وہ مرے ذہنِ رسا سے نکلا
مہر جو مبدءِ فیاض سے الہام ہوا

عشق کی یوں تحقیر نہ کر

(حضرت شباب بدایونی)

فریاد جفا ہے ننگِ وفا یوں الفت کی تحقیر نہ کر
یا ہاتھ اٹھا لے جینے سے یا دل کو تمنّا گیر نہ کر

آساں ہے "انا العاشق" کہنا، مشکل ہے غمِ الفت سہنا
اے بیخبر تسلیم و رضا اف منہ سے دمِ تعذیر نہ کر

اے مستِ فریبِ ناز و وفا ہر حال میں رہ راضی بہ رضا
خواہش ہے بنائے بوالہوسی الفت سے اسے تعبیر نہ کر

ہر پرسشِ غم پر رو دینا ہے آبروئے غم کھو دینا!
یا دعوی عشق سے باز آجا یا عشق کی یوں تحقیر نہ کر

اے دل یہ جنونِ خام ترا کام آیا اور نہ آئے گا!
نالوں کی ندامت کافی ہے اب آرزوئے تاثیر نہ کر

محشر میں ستمگر سے شکوہ اے دل ہے خلافِ پاسِ وفا!
جو ہاتھ اٹھے ہوں بہرِ دعا اب ان کو گریباں گیر نہ کر

پرغم ہیں بہت یہ افسانے، کیوں ہوتے ہیں اپنے بیگانے
بس کہہ نہ شباب اس باتیں کچھ منہ بند ہی رکھ تقریر نہ کر

داستانِ محبّت

حضرتؔ قمر نعمانی سہسرامی)

میرا جنونِ شوق عجب کام آ گیا!
وہ مسکرائے اور میں کونین پا گیا!

سعیٔ شکیب تشنۂ تکمیل ہی رہی
ابرِ بہار آ کے فضاؤں پہ چھا گیا

میں اور قطعِ راہِ محبّت نہیں نہیں!
تائید تھی کسی کی یہاں تک جو آ گیا

پچھتا رہا ہوں ان کو پشیمان دیکھ کر
کیوں ساری داستانِ محبّت سُنا گیا

اب کیا کروں جو آپ کی محفل پہ بار ہوں
مجبور ہو کے دل سے یہاں تک میں آ گیا

اس دل کی عظمتوں پہ ہیں دونوں جہاں نثار
جو دل کہ بارِ دردِ محبّت اُٹھا گیا

بخشِ رسا سے چاہیئے اب اور کیا قمرؔ
چشمِ حیا سے ان کی میں سب کچھ ہی پا گیا

صبح گلستاں دیکھئے

حضرت محبوب حسن آسی ڈڈرکوی

نقشِ آئینِ نگاہِ شوق ساماں دیکھئے
حسن اب خود ہے تجلی کا نگہباں دیکھئے

خندۂ گل، گریۂ شبنم، رمِ موجِ نسیم
دیکھنے کی چیز ہے صبحِ گلستاں دیکھئے

ضبط کرنے تو چلے ہیں آپ اُن کی یاد کو
ہو نہ جائے ایک دِن یہ درپئے جاں دیکھئے

عرصۂ دیر و حرم ہو وہ کہ ہو میدانِ حشر
جو دکھائے تشنگئ ذوقِ عرفاں دیکھئے

بے سبب تو ہے نہیں پھولوں کی یہ پژمردگی
سینۂ گلشن میں ہوگی آگ پنہاں دیکھئے

دل پہ قابو ہے محبت میں نہ خود پر اختیار
کس قدر مجبور ہے فطرت سے انساں دیکھئے

راہ بر تو دل ہے آسی رہ گذارِ عشق میں
عقل کی آنکھوں سے کیا دشوار و آساں دیکھئے

نمایاں ہو کے رہتی ہے

(حضرت سرور بھوپالی)

ستم کے لاکھ پردوں سے بھی عریاں ہو کر رہتی ہے
محبت پھر محبت ہے نمایاں ہو کے رہتی ہے

ہجومِ غم میں بھی میں مسکراتا ہی رہوں لیکن!
وہ کیفیت جو چہرے سے نمایاں ہو کے رہتی ہے

اک ایسا وقت بھی آتا ہے طوفانِ مسرت میں
طبیعت لاکھ بہلاؤ پریشاں ہو کے رہتی ہے

مجھے شکوہ نہیں تیرے ستمہائے فراواں کا
سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل بھی آساں ہو کے رہتی ہے

جنونِ عشق و غم کی ہائے رے یہ فتنہ سامانی
کلی کھلتی ہے لیکن چاک درماں ہو کے رہتی ہے

محبت کی اب اُس منزل میں رکھا ہے قدم میں نے
جہاں ہر شے حریفِ کفر و ایماں ہو کے رہتی ہے

سرور اہلِ کرم کا شکوۂ نامہربانی کیا
یہ دنیا ہے یہاں ہر آنکھ گریاں ہو کے رہتی ہے

نظامِ فطرت

(حضرت بزمی وارثی لکھیم پوری)

خوشا وہ دورِ جنوں کہ پاسِ ادب جب انتہا کیا کرینگے
جہاں پہ ان کی نظر پڑیگی وہیں پہ سجدہ ادا کرینگے

کہاں کی منزل، کدھر کا جادہ، جو ملکے طے راستہ کرینگے
جہاں پہ کشتی رُکے گی اپنی وہیں پہ ساحل بنا کرینگے

نظامِ فطرت اسی طرح ہے، کہاں تک اس کا گلا کرینگے
یوں ہی چمکتی رہیگی بجلی، یونہی نشیمن جلا کرینگے

ابھی سے عقل و خرد میں ہلچل، ابھی سے نبضِ حواس برھم
عجب قیامت کا وقت ہوگا ہم انسے جب سامنا کرینگے

وہ جا رہے ہیں تو کیا غم انکا ابھی تو حدِ نگاہ میں ھیں!
نگاہ بھی جب نہ جا سکیگی خیال کا آسرا کرینگے

غضب کا طوفاں اُٹھا تو اٹھے، شکستہ کشتی ہوئی تو کیا غم
بنائینگے عزم کا سفینہ، طلب کو ہم ناخدا کرینگے

ھماری تقدیر کے ارادے کسی پہ کیوں منحصر ہوں بزمی
ہم اپنے ذہن و نظر کے مالک ہیں خود کوئی فیصلہ کرینگے

جستجوئے منزل

(حضرت آذر سرحدی)

حواس گم ہیں، دماغ بیکار، ہوش کا کچھ پتا نہیں ہے
ہوئی ہے ہلکی سی ایک جنبش، ابھی تو پردہ اٹھا نہیں ہے

نہیں ہوں میں مدعی کسی کا، کوئی مرا مدعا نہیں ہے
دکھے ہوئے دل کی التجا ہے لبوں پہ میرے دعا نہیں ہے

ابھی ہیں سمٹے ہوئے سے آنسو، ابھی ہیں ٹھٹھری ہوئی سی آہیں
ابھی یہ آندھی چلی نہیں ہے، ابھی یہ طوفاں اٹھا نہیں ہے

بقدرِ ہمت نشانِ جادہ مٹا مٹا کر بڑھے چلوں گا
نہیں مجھے جستجوئے منزل کہ حدِّ راہِ وفا نہیں ہے

کبھی کیا تھا جو بیخودی میں، جو حاصلِ ذوقِ بندگی تھا!
اگر نہیں ہے روا وہ سجدہ تو کوئی سجدہ روا نہیں ہے

یہ نیچی نظریں یہ ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پہ رقصاں
حقیقتاً اس سے اور بڑھ کر ادائے عہدِ وفا نہیں ہے

وہی ہے عرفاں کی آخری حد، وہی خودی کا مقام آذر
جہاں ظواہر میں عکس میرا ہے اور کوئی دوسرا نہیں ہے

"کچھ بھی نہیں"

(حضرت انور بھوپالی)

تری نگاہ کے قابل نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ دل خدا کی قسم دل نہیں تو کچھ بھی نہیں!

وہ گریہ سحری ہو کہ آہ نیم شبی!
حریف مطلب مشکل نہیں تو کچھ بھی نہیں!

یہ اضطراب، یہ ذوقِ یقیں، یہ شوقِ عمل
دلیل زندگیِ دل نہیں تو کچھ بھی نہیں

تغیّرات مسلسل، حوادث پیہم!
تمام عمر کا حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ جبر و قدرِ مشیّت، یہ قوّتِ فطرت
بقدرِ حوصلۂ دل نہیں تو کچھ بھی نہیں

ترے بغیر تو فردوس بھی جہنم ہے
بہشت اگر تری محفل نہیں تو کچھ بھی نہیں

تجلّیاتِ محبت میں ڈوب کر انورؔ
ز فرق تا بہ قدم دل نہیں تو کچھ بھی نہیں

فریبِ شوق

(حضرت نظرؔ مالیگانوی)

ستم سے ہاتھ اٹھایا جا رہا ہے
یہ کیا اب دل میں آیا جا رہا ہے

مئے ومینا، مے ومینا کا حاصل!
تری آنکھوں میں پایا جا رہا ہے

کہاں کی دید، اور کس کا نظارہ
فریبِ شوق کھایا جا رہا ہے

مدد اے ضبطِ غم ہے وقت نازک
تبسّم لب پہ آیا جا رہا ہے

ترے انداز بھی کچھ کچھ ابھی سے
تری شوخی سے پایا جا رہا ہے

محبت کو خودی کا رنگ دے کر
نہ جانے کیا بنایا جا رہا ہے

جہاں کو حسن کا مرکز بنا کر
نظرؔ کو آزمایا جا رہا ہے

کمالِ بیکسی

(حضرت صابر اکبر آبادی)

تمہارا غم بھی راس آیا نہ راس آئی خوشی اپنی
کمالِ بیکسی تک آ گئی دیوانگی اپنی

تمہاری ہی خوشی سے ہے دو عالم کی خوشی اپنی
تبسّم صبح کا اپنا ستاروں کی ہنسی اپنی

مبصّر حال و ماضی کی بنی ہے بیکسی اپنی
نئے عنوان سے ہو گی بسر اب زندگی اپنی

محبت رفتہ رفتہ رنگ پر آئی خدا رکھے!
انہیں اپنا بنایا اور محبّت ہو گئی اپنی!

ہمیں تو یہ نہیں معلوم کعبہ تھا کہ بتخانہ!
بس اتنا جانتے ہیں ہم کہیں گردن جھکی اپنی

وہی عالم رہا ویرانہ سامانی کا آنکھوں میں
خزاں میں اپنی گذری یا بہاروں میں کٹی اپنی

مزاجِ عاشقانہ مجھکو فطرت نے دیا صابر
کھلاتی ہے گلِ صد رنگ فکرِ شاعری اپنی

میری جنّت تری نگاہ میں ہے

(حضرتِ نشاطؔ امروہوی)

نغمہ و مے نہ اشک و آہ میں ہے
میری جنت تری نگاہ میں ہے

کون اِس رازِ عشق کو سمجھے
جو ہے منزل پہ وہ بھی راہ میں ہے

تھی بہت دور حُسنِ بے منزل
وہ بھی اب دامنِ نگاہ میں ہے

عِشق مجبورِ حُسن کیا معنٰی
حُسن خود عشق کی پناہ میں ہے

کون گذرا ہے کارواں کے ساتھ
اک کشش سی جو گردِ راہ میں ہے

کون اٹھا ہے آج محفل سے
ایک طوفان جلوہ گاہ میں ہے

کیا کروں سیرِ جلوہ اب میں نشاطؔ
حسنِ کامل میری نگاہ میں ہے

موجِ طوفان!

(حضرت محمد اللہ بسمل سیمابی)

صبحِ طرب، نشاطِ محفل کو ڈھونڈتا ہوں!
جلوہ طرازِ محفل اک دل کو ڈھونڈتا ہوں
لی شمع نے بھی ہچکی، تارے بھی جھلملائے
میں ہوں کہ اپنی دھن میں منزل کو ڈھونڈتا ہوں
میں نے کئے ہیں پیدا آہوں سے کچھ شرارے
اب ان کی روشنی میں منزل کو ڈھونڈتا ہوں
کرتے ہیں آسماں پر سرگوشیاں ستارے
جب پچھلی رات اٹھ کر میں دل کو ڈھونڈتا ہوں
تیری نظر نے کردی یہ کیا فسوں طرازی!
جب تجھکو ڈھونڈھتا تھا اب دل کو ڈھونڈھتا ہوں
تنگ آ گئے آج موجِ طوفانِ زندگی سے
سانسوں کے جزر و مد میں ساحل کو ڈھونڈھتا ہوں
سیمابِ نکتہ داں کا یہ فیض ہے کہ بسملؔ!
جب ٹوٹتا ہے تارا میں دل کو ڈھونڈھتا ہوں!

نقوشِ قدم

(حضرت واثق ٹونکی)

چمن میں لطفِ اسیری دکھانے آیا ہوں
قفس سے اپنا نشیمن مٹانے آیا ہوں!

خیال ہے کہ اس عالم پہ روشنی ڈالوں
چراغ یوں سرِ تربت جلانے آیا ہوں

سدا بہار بناتا ہے باغبانِ گلشن!
میں اقتدارِ خزاں کا مٹانے آیا ہوں

میں دستِ گلچیں سے چھینوں گا امتیازِ چمن
چمن کو یعنی نشیمن بنانے آیا ہوں

کئے ہیں جذب جو آنکھوں نے حسن کے جلوے
ہر اک نظر کو وہ جلوے دکھانے آیا ہوں

ہو خوف جن سے بھٹک جائے کارواں کوئی
میں اُن نقوشِ قدم کو مٹانے آیا ہوں

عروج ہو کسی نااہل کو اگر واثق
میں اس عروج کو پستی میں لانے آیا ہوں

حقیقتِ غم و شادی

(حضرت ساحل ٹونکی)

جہاں کرم کی ترے بارشیں ہوں ساقی عام
وہاں ستم ہے رہوں ایک میں ہی تشنہ کام

طرح طرح ترے جلووں کی ہے نمائش عام
کہیں بشکلِ سحر اور کہیں بصورت شام

نہ کچھ بہار و خزاں ہیں بجز فریبِ نظر!
حقیقتِ غم و شادی نہیں بجز اوہام

رہا نہ دل کو کچھ اب امتیازِ روز و شب
گذر رہے ہیں کچھ اس طرح میرے صبح و شام

زمانہ قدر شناسِ متاعِ درد نہیں
یہ کس کے سامنے روتا ہے اے دلِ ناکام

مقامِ عشق و محبت کی رفعتوں کی قسم
ہزار بار میں ٹھکرا چکا ہوں دانہ و دام

یہ عشق وہ ہے کہ جس کی جناب میں ساحل
کمالِ عقل نہیں کچھ بجز جنونِ خام

دُنیا سازی

(حضرت سیر احدی اجمیری)

دنیا پہ اگر پڑ جائے اثر اس چشم کی سحر طرازی کا
پیچان کبھی دعویٰ کرنے لگیں سو جان سے پھر جانبازی کا

ہم جسکو عشق سمجھتے تھے، ہم جس کو الفت جانتے تھے
اک جوش تھا بہتے دریا کا، اک کھیل تھا آتش بازی کا

جب شعلہ رخوں پہ مرتے تھے جب جان کو جان سمجھتے تھے
وہ وقت گئے دل سوزی کے وہ دور گیا جانبازی کا

اب رغبت ہوتی جاتی ہے کچھ دل کو عشقِ حقیقی سے
اب پردہ اٹھتا جاتا ہے آنکھوں سے عشق مجازی کا

گر سیر ترقی چاہتا ہے مِل اونچے اونچے لوگوں سے
دنیا میں اگر خوش رہتا ہے بن خوگر دنیا سازی کا

تلخیِ فراق

(حضرت اشرف سعدی)

ہے زندگی کی شام و سحر زندگی کے ساتھ
آثارِ غم بھی پیشِ نظر ہیں خوشی کے ساتھ

پیشِ نظر ہے آئینۂ فطرتِ جمال
گم کردہ حواس بھی ہوں آگہی کے ساتھ

ہر گام پر تلاش کیا نقش پائے دوست
منزل کی جستجو بھی رہی گمرہی کے ساتھ

ساقی نہ پوچھ مجھ سے مری مستیوں کا راز
سرشارِ چشمِ مست بھی ہوں میکشی کے ساتھ

ہر آستانِ ناز نہیں سجدہ گاہِ شوق
یہ احتیاط بھی ہے تری بندگی کے ساتھ

اک تلخیِ فراق ہے انجامِ کارِ عشق!
وہ بے نیازِ دوست رہا دوستی کے ساتھ

اشرف نشاطِ وصل، پیامِ فراق تھی
گذری حیاتِ عشق بھی کس بیکسی کے ساتھ

کشاکشِ غمِ پنہاں

(حضرت مہر تقوی بجے پوری)

احباب دل نواز کا ارماں ہی اور ہے
لیکن کشاکشِ غمِ پنہاں ہی اور ہے

غیروں کے دم قدم سے وہ دلچسپیاں کہاں
اب تو فضائے کوچہ جاناں ہی اور ہے

ہے عالمِ بہار کا عنوانِ رنگ و بو
لیکن مری بہار کا عنواں ہی اور ہے

جب تم نہ تھے تو حالِ دل و جاں ہی اور تھا
تم آ گئے تو حالِ دل و جاں ہی اور ہے

اک گونہ دل کو چین تصور سے ہے مگر
لیکن نگاہِ شوق کا ارماں ہی اور ہے

اب نذرِ خارزارِ محبت کو اپنے پاس
دامن ہی اور ہے نہ گریباں ہی اور ہے

پھر تو خیالِ مہر کا امکاں ہی نہیں
جب دل میں آپ کے کوئی مہماں ہی اور ہے

دردِ عشق

(حضرت جذبی نیازی کانپوری)

غم اب سکونِ قلب کا حاصل نہیں رہا
اس موج کو علاقۂ ساحل نہیں رہا

اب کوئی اپنا بارِ امانت سنبھال لے
دل دردِ عشق کا متحمّل نہیں رہا

تمکین و ہوش ہی نہ کہیں تجھ کو لوٹ لیں
غافل نہ ہو کہ رہزنِ منزل نہیں رہا

جوشِ بہار ہے وہی رنگِ چمن وہی
دل شدتِ الم سے مگر دل نہیں رہا

میرا خیال ہی تھا طلسمِ حجابِ دوست
اُٹھی نظر تو پردۂ محمل نہیں رہا

تجھ سے نگاہ ملتے ہی سب اُٹھ گئے حجاب
نظروں میں کوئی جلوۂ باطل نہیں رہا

جذبی نگاہِ دوست تو ہے مائلِ کرم!
لیکن یہ دل ہی اب کسی قابل نہیں رہا

شعلۂ رنگین

(حضرت انجام کاشمیری)

ایسا نہ ہو وہ اور نئی آگ لگا دے
اے سوزِ نہاں شمعِ تمنا کو بجھا دے

اس واسطے قیمت ہے گراں ساغرِ دل کی!
گر ٹوٹ بھی جائے تو نہ زنہار صدا دے

اک روز ِ اعشق تراشن نہ ہو جائے
جلوہ کی تمنا مجھے جلوہ نہ بنا دے

ملتا نہیں مانگے سے کبھی دردِ محبت
یہ دین اسی کی ہے جسے چاہے خدا دے

انجام رہے گا یوں ہی ناکامِ محبت
یہ شعلۂ رنگیں اسے جبتک نہ جلا دے

انجامِ محبت

(حضرت عزیز جونپوری)

آج ہنستی ہے جو مجھ پر مرے کھو جانے سے
جاگ اٹھی تھی یہی دنیا مرے افسانے سے

شاخ در شاخ مسائل ہیں حق و باطل کے
کتنی بحثیں ہوئیں پیدا ترے چھپ جانے سے

کیوں نہ کرنوں میں ہو موج مے عرفاں کی جھلک
صبح نورانی ہے سورج مرے میخانے سے

جلوۂ گل نہ رہا نغمۂ بلبل نہ رہا
کتنا سونا ہے چمن انکے چلے جانے سے

کل سے کچھ اور بھی بیتاب محبت ہے عزیز
ہائے کیوں مل گئے ساحل پہ وہ دیوانے سے

رنگِ خودی

(تحریر صاحبزادی اداؔ ٹونکی سیمابی)

دل سے خودی کا رنگ نہ جائے تو کیا کروں
اپنا ہی عکس مجھکو ستائے تو کیا کروں

آنے سے انکے ہو تو گئی درد میں کمی
لیکن قرار دل کو نہ آئے تو کیا کروں

خود روح اپنے مسکنِ خاکی کو چھوڑ دے
اس طرح تیری یاد جو آئے تو کیا کروں

قسمت میں جو لکھا ہے ملے گا وہی مگر!
دستِ دعا کو چین نہ آئے تو کیا کروں

ہر چند میں تو ضابط و صابر ہوں اے اداؔ
مجھ کو زمانہ پھر بھی ستائے تو کیا کروں

عنوانِ اُلفت

(مس بلدیپ کور دیپؔ صاحبہ)

دفعتاً کیوں آج ضد کرتے ہو جانے کیلئے!
کل تمہیں مضطر تھے ان آنکھوں میں آنکھیں آنے کیلئے

جانتی ہوں ان کا انداز تواضع ہمنشیں!
اپنی محفل میں بٹھاتے ہیں اٹھانے کیلئے

کیا مجھے مایوس کرکے آپ کو چین آگیا
اور بھی تو تھے طریقے آزمانے کیلئے

آپ نے افسانہ سارا آنکھوں سے دکھلا دیا مجھے
مل گیا عنوانِ الفت کے فسانے کیلئے

کیوں مآلِ عشق سے گھبرا رہی ہو دیپؔ آج
کون کل تک مضطرب تھا دل لگانے کیلئے

ذوقِ طلب

(حضرت ہوشؔ میرٹھی)

مِرا ذوقِ طلب رتبہ شناسِ دل نہ بن جائے
یہی رہبر و کہیں خضرِ رہِ منزل نہ بن جائے

وفورِ دردِ دل وجہِ سکونِ دل نہ بن جائے
یہ طوفانِ بحرِ ہستی کا کہیں ساحل نہ بن جائے

نہ گھبرا اے مسافر تو ہجومِ یاس پیہم سے
یہی مایوسیٔ منزل تری منزل نہ بن جائے

مرا حسنِ تخیّل جب ترے جلووں سے روشن ہے
مری بزمِ تصور بھی تری محفل نہ بن جائے

شعاعیں حسن کی ڈالو نہ اپنے ہوشؔ پر ایسے
کہیں یہ خاک کا ذرہ مہِ کامل نہ بن جائے

غنچہ و گل

(حضرت کلیمؔ شمس آبادی)

غنچہ و گل، طوطیٔ رنگیں نوا کچھ بھی نہیں
گلستاں کی یہ بہارِ جاں فزا کچھ بھی نہیں

کیا ہوا اگر ہیں بہم سامانِ عیش و انبساط
تم نہیں تو زندگانی کا مزا کچھ بھی نہیں

اک کشش تھی کھینچ لائی جو تمہاری بزم میں
مدعا کیا پوچھتے ہو مدعا کچھ بھی نہیں

تو دلِ ناداں خرامِ ناز سمجھا ہے جسے
اک قیامت خیز فتنے کے سوا کچھ بھی نہیں

رونقِ صحنِ گلستاں ان کے دم سے تھی کلیمؔ
وہ نہیں تو گل فشانیٔ فضا کچھ بھی نہیں

پیغامِ محبّت

(حضرت معراج لکھنوی)

خود کو آئینہ بنا جوہر حیرانی دے
دل کو پھر دعوتِ صد جلوۂ نورانی دے

کس طرح تیرے حجابات کا عالم دیکھوں
اتنی فرصت بھی تو جلوؤں کی فراوانی دے

مطمئن دل کو ستانا ہی اگر ہے منظور
اپنی ہی زلف کا اندازِ پریشانی دے

بانٹ دے میری خوشی بھی مِرے خالق سب کو
لا مجھے سارے زمانے کی پریشانی دے

آہ وہ لائے جو پیغامِ محبّت معراج
درد وہ درد ہے جو لذّتِ روحانی دے

شکایت نہیں ہے

(حضرت تاج محمد شہرت)

اگر تجھ سے ان کو شکایت نہیں ہے
تو سب کچھ ہے لیکن محبت نہیں ہے

زمانے کی فطرت سے میں آشنا ہوں!
مجھے اب کسی سے شکایت نہیں ہے

کریں حال اپنا بیاں ہم تو کیوں کر!
زبان و نظر کو اجازت نہیں ہے.

یہ بزمِ جہاں مثلِ آئینہ خانہ
حقیقت نما ہے حقیقت نہیں ہے

ازل سے ہی شہرت ہوں مایوسِ حسرت
مجھے احتیاجِ مسرت نہیں ہے

اعجازِ مسیحائی

(حضرت مقرب دہلوی)

تم نے لبِ لعلیں سے کچھ بات نہ فرمائی
ہونٹوں پہ بہت مچلا اعجازِ مسیحائی

دیوانہ بہ کارِ خود دیوانہ نہیں ہوتا
کہنے دو جو کہتی ہے دنیا مجھے سودائی

ہوشیار کہ آپہنچا اب عہدِ شباب ان کا
غنچہ کے چٹکنے کی کانوں میں صدا آئی

میں کیوں نہ جھکاؤں سر میں کیوں نہ کروں سجدہ
محراب ہے کعبہ کی ظالم تری انگڑائی

قربت ہے حسینوں سے یوں نام مقرب ہے
اور کام فقط اتنا اک در کی جبیں سائی

بزمِ زندگی

(حضرت زیدی)

تری خاطر ہمیشہ غم کو سمجھا ہے خوشی ہمنے
محبت میں نہ جانا زندگی کو زندگی ہمنے

خدارا دل کے زخموں پر کہیں مرہم نہ رکھ دینا
انہی زخموں سے روشن کی ہے بزمِ زندگی ہمنے

کریں کس منہ سے شکوہ دوستوں کی بیوفائی کا
ہمیشہ دشمنوں کے ساتھ کی ہے دوستی ہمنے

دلیلِ خود نمائی بن گیا تیرا حجاب آخر
ہر اک ذرے میں دیکھی ہے تری تابندگی ہمنے

سمجھتے ہیں غمِ الفت کا جو انجام ہے زیدی
ہوا کے رخ پہ رکھا ہے چراغِ زندگی ہمنے

شعبدۂ شباب

(حضرت خطیر جھالوی)

نہ کوئی سنتا ہے ورنہ سناؤں غم کا کسے فسانہ
مگر مری بیکسی ہے جس نے ادا کیا حق دوستانہ

نہ سمجھے راز غم محبت یہ کیف آغاز عاشقانہ
رباب ہستی سے آ رہی تھی صدائے مستقبل زمانہ

خزاں نسیم بہار گیسو کی اس سے مطلب اس سے خطرہ
نہ شائق رنگ و بوئے گلشن نہ دل میں یاد آشیانہ

اسیر نیرنگ حسن رنگین جو دل ہوا کیا خطا ہے اسکی
شباب نے شعبدے دکھائے تھے کیوں یہ انداز ساحرانہ

خطیر کی موت و زندگی ہے تمہارے تیر نظر کے قربان
ہدف بنایا دل و جگر کو عجب ادا سے بیک نشانہ

آشنا نہیں ہے

(حضرت باقی اعظمی)

زمانہ گھبرا کے کہہ رہا ہے بجا نہیں تھا بجا نہیں ہے
ستم ہی ہم پر وہ ہو رہا ہے کسی طرح جو روا نہیں ہے

جنوں ہے کامل او عزم پختہ نہیں ہے سودا کسی کے پا کا
چلا ہوں یوں اپنی دھن میں جیسے کہ مڑ کے پیچھے تکا نہیں ہے

فضا مکدر ہوا مخالف نہ کوئی مونس نہ کوئی یاور
کہاں نکل آئے ہم الٰہی جہاں کوئی آشنا نہیں ہے

نہ آئے کیونکر زبان پہ شکوہ کہیں فقیری ہو نہ رسوا
خموش ہونٹوں کو ہو نہ جنبش یہ عشق کا اقتضا نہیں ہے

خدا کو معلوم ہے یہ باقی ہیں ٹھوکریں اور کتنی کھانی
تلاش میں جس کی ہوں ازل سے وہ مجھکو اب تک ملا نہیں ہے

سرشتِ عشق

(حضرت معینؔ نظامی میرٹھی)

میں اپنے دل سے جہاں میں سکون پا نہ سکا
شریکِ کار بھی ہو کر یہ کام آ نہ سکا

شعارِ حسن تغافل، سرشتِ عشق وفا
بھلایا جس نے مجھے میں اسے بھلا نہ سکا

وہ میرے دل نے مشیّت سے ہنس کے مانگ لیا
جو دردِ وسعتِ کونین میں سما نہ سکا

بہار ہوش ربا، اور خزاں خمار شکن
کوئی زمانہ مجھے سازگار آ نہ سکا

تھے لاکھ ماہرِ فن اے معینؔ دنیا میں
مگر مراتبِ "سیماب" کوئی پا نہ سکا

حسرتِ شوقِ جمال

(حضرت قیسؔ مینڈوی)

ہو گئے مجبور ہی کچھ اضطرابِ دل سے ہم
ورنہ اٹھ کر یوں چلے آتے تری محفل سے ہم

کچھ نہ کی گرداب نے بھی تہ نشینی میں مدد
لو ابھرتے ڈوبتے پھر آ گئے ساحل سے ہم

کچھ نشاں سے پا رہے ہیں یادگارِ عشق کے
یاد آتا ہے کبھی گذرے تھے اس منزل سے ہم

چپکے چپکے رو رہے تھے دیکھ کر احباب سب
رفتہ رفتہ ہو رہے تھے دور جب ساحل سے ہم

قیسؔ نکلے گی کبھی تو حسرتِ شوقِ جمال
بیٹھے ہیں وابستہ ان کے پردۂ محمل سے ہم

افسانۂ جمال

(حضرت اکرم حنیفی ڈھولیوی)

سحرِ حلال، برقِ تپاں دشمنِ سکوں!
اس کی نگاہِ ناز کو میں اور کیا کہوں

خواہانِ اضطراب نہ میں طالبِ سکوں
دل سے دعا یہ ہے کہ سلامت رہے جنوں

جس میں ترا خیال ہو جس میں ہو تیری یاد!
وہ اضطرابِ عشق ہے صد نازشِ سکوں

افسانۂ جمال کو دہرا رہا ہوں میں!
سازِ ازل کا نغمہ طرازِ قدیم ہوں

کچھ اور چاہتا نہیں دیوانہ جمال!
آتی رہے بہار پنپتا رہے جنوں!

اس کی ابھی اسیرِ خرد کو خبر کہاں!
زندانِ آب و گل میں بھی آزاد ہے جنوں

اکرم ہے بے نیازِ شکایت وہ فتنہ گر
ہے مصلحت اسی میں کہ خاموش ہو رہوں

ہے کافر ہر انداز اللہ رکھے

(حضرت رضوی خیرآبادی)

جوانی کا آغاز، اللہ رکھے
ہے کافر ہر انداز اللہ رکھے

چکھا دے ذرا لذّتِ مے بھی ساقی
درِ توبہ ہے باز اللہ رکھے

چھپائے نہیں عشق چھپتا دعا ہے
ترے راز کو راز اللہ رکھے

مجھے حسن نے عشق کرنا سکھایا
نہیں کم یہ اعجاز اللہ رکھے

کھٹکتا ہے نظروں میں صیّاد کی بھی
مرا ذوقِ پرواز اللہ رکھے

مجھے لے ہی پہنچیگا منزل پہ آخر
شعورِ تگ و تاز اللہ رکھے

غزل گنگنائے نہ کیوں اپنی رضوی
جو تو چھیڑ دے ساز اللہ رکھے

وقت کی نبضیں

(حضرت سیماب اکبر آبادی)

سازگاری کا نہیں اے مطرب آغاز ابھی

سازِ چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

جنگ کے آتش فشانوں کی دبی چنگاریاں!
کر رہی ہیں آج بھی دنیا میں شعلہ باریاں
بڑھ رہی ہیں خواریاں، لاچاریاں، بیزاریاں
ہے مگر انسان میں باقی غرور و ناز ابھی

سازِ چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

خوابِ بیداری ہے طاری دیدۂ اقوام پر
ہیں وطن آزاریاں جاری وطن کے نام پر

جاگ اٹھتا ہے نیا فتنہ نئے ہر گام پر
شورشیں ناسازیٔ عالم کی ہیں غمّاز ابھی
سازِ چھیڑے جامِ مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

اب بھی طیّاروں میں ہر سمت جہنّم ہیں رواں
غیر محفوظ اب بھی ہیں دشت و جبال و گلستاں
زندگی سہمی ہوئی ہے آشیاں در آشیاں
موت ہے ہر سو فضا میں مائلِ پرواز ابھی
سازِ چھیڑے جامِ مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

اب خودی والوں کی دنیا میں خودی ہے حشر خیز
شخصیّت سے شخصیّت ہے آج سرگرمِ ستیز
آمریّت کی صدائیں ہیں، بزن، بشکن، بریز
جستجوئے صید میں ہے فطرتِ شہباز ابھی
سازِ چھیڑے جامِ مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

انتشارِ بزمِ عالم ہے، مآلِ کشت و خوں
چارہ گر سودا زدہ ہیں، عقل ہے صیدِ جنوں
ہو رہا ہے منتشر، شیرازۂ امن و سکوں
اور منشائے الٰہی ہے بقیدِ راز ابھی

ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

مطربہ! نغمے ترے، اور ساز کا کیف و اثر
چاہیں تو رکھ دیں الٹ کر یہ بساطِ بحر و بر
اور اک دنیا نئی آباد ہو جائے مگر
روحِ ہستی تک نہیں پہونچی تری آواز ابھی

ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

"حسین آگ"

(حضرت جاں نثار اختر)

تیری پیشانیٔ رنگیں میں جھلکتی ہے جو آگ
تیرے رخسار کے پھولوں میں دمکتی ہے جو آگ
تیرے سینے میں جوانی کی دہکتی ہے جو آگ
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

تیری آنکھوں میں فروزاں ہیں جوانی کے شرار
لب گلرنگ پہ رقصاں ہیں جوانی کے شرار
تری ہر سانس میں غلطاں ہیں جوانی کے شرار
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

ہر ادا میں یہ تری، آتشِ جذبات کی رو
یہ مچلتے ہوئے شعلے یہ تڑپتی ہوئی لو!

آ مری روح پہ بھی ڈال دے اپنا پرتو
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

کیسی محروم نگاہیں ہیں تجھے کیا معلوم
کتنی ترسی مری باہیں ہیں تجھے کیا معلوم
کیسی دھندلی مری راہیں ہیں تجھے کیا معلوم
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

ظلمتِ یاس میں کچھ نور کا ساماں کرلوں!
اپنے تاریک شبستاں کو شبستاں کرلوں!
پھر سے سینے میں کوئی شمع فروزاں کرلوں
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

بارِ ظلمات سے سینے کی فضا ہے بوجھل
نہ کوئی سازِ تمنا نہ کوئی سوزِ عمل!
اُس مشعل سے تری میں بھی جلالوں مشعل
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دیدے

"حُسنِ معصوم"

(حضرت ماہر القادری)

یہ کمسنی کا زمانہ، یہ ابتدائے شباب
یہ شوخیوں کے اُفق سے طلوعِ مہرِ حجاب
جھکی جھکی سی نگاہیں کہ نیم وا غنچے
رُکا رُکا سا تبسّم کہ ناشگفتہ گلاب
زہے جمال! یہ عالم ہے جامہ زیبی کا
کہ سادہ چھینٹ بدن پر ہے غیرتِ کمخواب

زِ فرق تا بہ قدم سحر و نغمہ و مستی!
نظر نظر میں فسانہ، نفس نفس میں رباب

جو دیکھیے تو ہر اک پر نظر توجّہ کی
جو سوچیے تو کسی سے نہیں ہے کوئی خطاب

نہ فکرِ غم، نہ کوئی تجربہ زمانے کا
ابھی ہے سادہ و بیرنگ زندگی کی کتاب

شباب آیا تو وہ بے تکلّفی نہ رہی!
یہ احتیاط، یہ بندش، یہ زحمتِ جلباب

خدا کرے یہ نگاہِ جہاں سے دور رہے
کہ اس زمانے میں ہے عصمتِ نظر نایاب

ایک مغربی سیّاح سے

(حضرت بہار کوٹی)

ان لہکتے لہلہاتے مرغزاروں پر نہ جا
اپنے مستقبل سے بے پروا بہاروں پر نہ جا
راوی و گنگا کے خوش منظر کناروں پر نہ جا
نرم رو شفاف نرمل جوئباروں پر نہ جا
غنچہ لب، گل پیرہن لالہ عذاروں پر نہ جا
مختصر سی زندگی والے شراروں پر نہ جا

مغربی غازے میں کفنائی ہوئی نعشیں نہ دیکھ
نیم عریاں، برہنہ سر ماہپاروں کو نہ دیکھ
نازشِ عفت سے مستغنی بہاروں کو نہ دیکھ
نوبہارِ حسن کے کافر اشاروں پر نہ جا
بے حقیقت کھوکھلی بے بود عشرت کو نہ دیکھ
عکس خانوں کے درخشندہ ستاروں پر نہ جا

میکدوں کے میکدہ بردوش ہنگامے نہ دیکھ
بے خبر، بے فکر، غافل میگساروں پر نہ جا
قمقموں سے جگمگاتی رقص گاہوں کو نہ دیکھ
چند اونچی کوٹھیوں، گنتی کی کاروں پر نہ جا
مسجدیں، آتشکدے، بتخانے گردوارے نہ دیکھ
عظمتِ دیرینہ کے ان شاہکاروں پر نہ جا
پیروں، سجادہ نشینوں کے تموّل کو نہ دیکھ
سونے چاندی کے کٹہروں کے مزاروں پہ نہ جا
راجہ، نوابوں، نظاموں کے نسب نامے نہ دیکھ
نام کے مصنوعی، نقلی تاجداروں پر نہ جا
عہدہ داروں کے وظیفہ خواروں کے دفتر نہ دیکھ
عارضی ہیں یہ سہارے ان سہاروں پر نہ جا
راؤں، نوابوں، سروں، خانوں کی فہرستیں نہ دیکھ
نام کے بھوکوں پر ان شہرت کے ماروں پر نہ جا
کھیتا ہے خاک فنوں سے دیکھ وہ مزدور دیکھ!
دیکھ سیر سے جسم کا رستا ہوا ناسور دیکھ
نکبت و افلاس کی تصویر ہے میرا وطن
اک بھیانک خانۂ زنجیر ہے میرا وطن

مآلِ تمنّا

(حضرت الم مظفر نگری)

یہ کہہ رہی تھی کلی شب کو دل میں ہو کے مگن
میں بن کے پھول چمن میں بنوں گی جانِ چمن
فضائے باغ مرے رنگِ و بو سے مہکے گی
روش روش پہ تجلّیٔ طور برسے گی

وہ جلوے ہیں جو ابھی تک رہینِ بندِ نقاب
بنیں گے روشنیٔ مہرِ آسماں کا جواب
زمیں پہ ہوں گی حریفِ ستارۂ سحری
گلاب بن کے گھٹا دوں گی تابشِ قمری

اسی خیال میں تھی وہ کہ صبحِ مہر جبیں
ہوئی طلوع بصد جلوہ ہائے با تمکیں
کلی کلی نہ رہی، بن گئی گلِ شاداب
کہا تڑپ کے کسی نے زہے "کمال شباب"

نظر نظر نے نمایاں تجلّیاں دیکھیں

ہر ایک سمت گلستاں میں بجلیاں کوندیں
رہینِ بے خودیٔ شوق تھے تماشائی

گلاب تھا کہ سرِ طور شمع روشن تھی
ہزار رنگ سے اپنی دکھا رہا تھا پھبن

سمجھ رہا تھا کہ ہے خود ہی مایہ دارِ چمن
کہ بادِ گرم کے جھونکے سے دفعتاً وہ گلاب

گرا زمیں پہ ہوا منتشر بحالِ خراب
کسی نے صحنِ چمن میں قریب ہی سے سنا

یہ خشک پتیوں سے اس کی آ رہی تھی صدا
عروجِ حسن نے مجھکو گرایا پستی میں

کلی ہی رہتا یہ اچھا تھا بارغ ہستی میں
تباہیوں کا ہے سرچشمہ انتہائے کمال

کمال ہی کو نہ پھر کیوں کہیں دلیلِ زوال

ہے کامیاب وہی اس جہانِ فانی میں
جو بے نیازِ تمنّا ہے زندگانی میں

بیوہ کی شادی!

(حضرت شفیق جونپوری)

سوغم و رنج اور اک ہستیٔ فانی یارب
زخمِ دل، داغِ جگر، سوزِ نہانی یارب
سرد آہیں تو کبھی اشک فشانی یارب
کیا اسی واسطے آئی تھی جوانی یارب

کون ہمراز ہے کس سے کہوں افسانۂ غم
غمگسارے، نہ رفیقے، نہ انیسے دارم

یاد گذری ہوئی راتوں کی جو تڑپاتی ہے
ضبط کرتی ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے
کیوں مسرت دلِ مایوس کو بہلاتی ہے
بے بلائے ہوئے کیوں گھر میں خوشی آتی ہے

ایک اُترے ہوئے چہرے کا نکھرنا کیسا!
اب مری زلفِ پریشاں کا سنورنا کیسا!

کس کی تصویر تصور میں نظر آتی ہے
آپ ہی آپ طبیعت مری گھبراتی ہے
جب خوشی کا کوئی پیغام سحر لاتی ہے
میرے کانوں میں کچھ آواز سی آجاتی ہے

جیسے روتا ہو محبت پسِ دیوار کوئی
اور کہتا ہو مرا گشتہ آزار کوئی

کیوں مری جانِ محبت کا سبق بھول گیا
چھپ کے روتی تھیں وہ دیرینہ قلق بھولگیا
میرے اخلاص مرے پیار کا حق بھول گیا
چاندنی آئی تو پھر خونِ شفق بھول گیا

رنگ پھیکا ہے محبت کی پرستاری کا
چہرہ اترا نظر آتا ہے وفاداری کا

شمع سے شکوہ کناں غیرتِ پروانہ ہے آج

محفلِ عشق کا عالم ہی جُداگانہ ہے آج
نہ وہ منزل ہے ہماری نہ وہ کاشانہ ہے آج
ہم سے رنجیدہ ہوا ہے درِ جانانہ ہے آج
بوئے عشرت کدہ دوست نہیں آتی ہے
اور آتی ہے تو کترا کے نکل جاتی ہے

آہ میرے لئے پھولوں کا مہکنا کیسا!
میرے امید کے پودوں کا لہکنا کیسا
اب منڈیروں پہ پرندوں کا چہکنا کیسا
وہ نہیں گھر میں تو سورج کا چمکنا کیسا
مطربہ گیت خوشی کے نہ سنائے مجھکو
چھیڑ کر بادِ بہاری نہ رلائے مجھکو

یار و احباب کو ذوقِ چمن آرائی ہو
مری تسکیں کیلئے گوشۂ تنہائی ہو
خوفِ بدبیں ہو نہ اندیشۂ رسوائی ہو
شورِ محشر بھی جگائے نہ وہ نیند آئی ہو

مرے محبوب اگر تو نہ بچانے آئے
تو بگولا مری میّت کو اٹھانے آئے

تجھ سے آباد تمناؤں کی محفل نہ رہی
دل کا جلسہ نہ رہا رات کی محفل نہ رہی
میں تری بارگہِ عشق کے قابل نہ رہی
کہ وہ لیلیٰ ہوں جو شائستہ محمل نہ رہی

غیر کے بالوں کا اب شانہ کبھی جاؤنگی
آج سے میں تری بیوہ نہ کبھی جاؤنگی

آج شرمندہ ہوا نازِ خود آرائی بھی!
آج مجروح ہوئی حُسن کی رعنائی بھی
حیف تقدیر میں لکھی تھی یہ رسوائی بھی
پاک دامن ہوں اور اک قسم کی ہرجائی بھی

تیری کہلا کے کسی اور کی کہلاؤں میں
کاش! پھٹ جائے زمیں اور سما جاؤں میں

میکدہ

(حضرت نہالؔ سیوہاروی)

اس جہاں کی جنتِ رنگیں جہانِ میکدہ
غیرتِ حُوران جنت حُوریانِ میکدہ

منزلت یہ صحبتِ رندانِ مے آشام کی
ہیں شریکِ دورِ ہیں حافظؔ و خیاؔم کی

عام ہیں کس درجہ اس عالم میں آثارِ حیات
چہرۂ ہر بادہ کش ہے مہرِ انوارِ حیات

حضرتِ واعظ کے خبطِ پارسائی کو نہ ڈھونڈ
بزمِ رنداں ہے یہاں زہد و ریائی کو نہ ڈھونڈ

حاصلِ ہر دو جہاں یک جرعۂ ساغر یہاں!

ننگِ عظمت، عظمتِ دارا و اسکندر یہاں

حکمتِ رندانہ سے جن کی ہوں ششدر اہلِ ہوش

جمع ہیں وہ محفلِ جام و سبو میں بادہ نوش!

جانتے ہیں کھیل غم کے سیلِ ہیبت ناک کو

چٹکیوں میں یہ اڑا دیں گردشِ افلاک کو

یہ وہ ہیں جو ظلمتوں کو صبح کا اجلال دیں

موت بھی آئے تو کیفِ زندگی میں ڈھال دیں

ان کی رگ رگ میں بجائے خوں مچلتی ہے حیات

جام چلتا ہے جدھر اس سمت چلتی ہے حیات

اپنی قسمت، اپنا یہ مقسوم ہیں سمجھے ہوئے

زندگی کی غائت و مفہوم ہیں سمجھے ہوئے

انکے مسلک میں جواز بادہ پانی ہے حرام
کیف سے خالی ہو جو وہ زندگانی ہے حرام
انکے مسلک میں بحر صہبا پرستی سب غلط
غم کے درد انگیز نوحے غم کی مستی سب غلط
قول ہے ان کا ہے عہدِ زیست پینے کیلئے
آدمی آیا ہے اس دنیا میں جینے کیلئے
ذکرِ تقویٰ، فکرِ عقبےٰ کو جنوں کہتے ہیں یہ
پائے بندِ زہد کو صیدِ زبوں کہتے ہیں یہ
اک طرف رندانِ خوش اطوار محوِ شغلِ جام
اِک طرف ساقی بصد انداز سرگرمِ خرام
موت اس ماحول سے پھرتی ہے گھبرائی ہوئی
زندگی ہی زندگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی

فلسفۂ شہادت

(از محترمہ زہرۂ سخن سیدہ اختر حیدرآبادی)

جب کہیں چھیڑتا ہے کوئی نغمۂ "آفت مآب"
زندگی ہر لحظہ و ساعت بجاتی ہے رباب

تو نے جانا ہی نہیں افسوس مفہوم شباب
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

جہدِ فکر و حریت میں ہیں جوانی کے مزے
حسن آزادی حقیقت میں ہے قوموں کا شباب

آہ! اے غافل کہ تو نے آج تک سمجھا نہیں
اہلِ عرفاں "صغرِ عمری" کو نہیں کہتے شباب

ہے شباب اک قوتِ ذوقِ طلب کا صرف نام

ذرہ ناچیز بنتا ہے اسی سے آفتاب

آج یہ اک نغمۂ رنگیں سنانا ہے مجھے!

لا، اِدھر لا، اے مرے مطرب! ذرا اپنا رباب

تاکہ تیرے ساز پر اک شعلۂ رنگین ہوں

یعنی دل کو چیر کر رکھ دوں بہ نیشِ اضطراب

پھونک دے رگ رگ میں میری بے نیازی کی روح

تاکہ میں دنیا سے یہ کہہ دوں بصد قہر و عتاب

جہدِ فکر و شوق سے روشن نہیں جس کی جبیں

اُس جواں قوم! آہ بڈھی قوم کی حاجت نہیں

عرفانیات

خودی

مجھکو خود دارِ زندگی سے کام
میں کہ اپنی سحر ہوں اپنی شام
عطر پر بھی ہے دست رس کوئی
نکہتِ گل چمن میں ہے بدنام

تعارف

گردشیں مجھ میں میرا اختر نام
ایک مرکز نہیں ہے میرا قیام
اس کو کیا دولتِ سکوں سے سکوں
جس کا مقصود ہے اضطراب مدام

زندگی

زندگی جاوداں ہے، رکتی ہے؟
ایک برقِ تپاں ہے رکتی ہے؟
کتنے ساحل بھی سامنے آئیں
کہیں موجِ رواں بھی رکتی ہے؟

(زہرہ سخن محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی)

"صبح آزادی کے خواب"

(ایک بشارت)

(افسر میمانی، احمد نگری)

ہو رہا ہے ذہن پر اوہامِ باطل کا نزول!
اب دعائیں نارسا ہیں، بند ہے بابِ قبول!

طائرانِ خوش نوا پر خندہ زن ہیں بوم و زاغ
عرش پر ہے اسکندر و چنگیز و نادر کا دماغ

خاک پر ٹوٹے پڑے ہیں انجم و خورشید و ماہ
اہرمن کی زیرِ نگرانی ہے تعمیرِ گناہ

تیز تر ہیں بجلیوں سے گردشیں ایام کی
اڑ رہی ہیں دھجیاں سی جامۂ احرام کی

اب کہاں ہیں دہر میں ہنگامہ ہائے رنگ و صوت
زندگی کتنی گراں ہے کس قدر ارزاں ہے موت

وہ خدا جس نے بنائے ساغرِ جم، تخت کے
صاحبِ ثروت کو دیتا ہے شراب و چنگ و نے

بے کس و مجبور ہیں دامِ فلاکت میں اسیر
آہ یہ دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر

آہ یہ خون خوار یہ سرمایہ دارِ حیلہ گر
اس کے تہہ خانے ہیں اور دہقاں کی محنت کا ثمر

دیکھتا ہے کاش وہ پروردگارِ بے نیاز
یہ پریشانی، یہ دردِ زندگی، یہ سوز و ساز

لیکن اے افسرؔ اسے کیا واسطہ مظلوم سے
وہ تو محوِ خواب ہے اک مدّتِ معلوم سے

رقص کرتی ہے شعاعِ اوّلیں ہر پھول پر

تازۂ روئے سحر ہے اوس کا خونِ جگر
اوس کی بے چارگی تسلیم! لیکن ہم نشین!
کس کے پرتو سے درخشاں ہے حریم یاسمین

پیکرِ تقلید میں پنہاں ہے روحِ اجتہاد
"آدمِ نو" توڑ دے گا یہ طلسماتِ تضاد!
گلشن تائید بھی ہے آتشِ تردید میں
اک بہارِ بے خزاں ہے معرضِ تولید میں
بزمِ نسریں مرکزِ تیغ و سلاسل ہے تو کیا
برقِ سوزندہ شرر باری پہ مائل ہے تو کیا!
ہے ابھی صحنِ گلستاں شورش افزائے نمو
جل رہا ہے چشمِ نرگس میں چراغِ آرزو!
بج رہی ہے ذرّے ذرّے میں نفیرِ انقلاب
تیرتے ہیں تیرگی میں، صبحِ آزادی کے خواب،

معصوم مسافر

(ماں کے تاثرات اپنی بیٹی کی یاد میں جو عین عید کے موقع پر فوت ہوگئی)

(حضرت ابوالاسرار رمزی اٹاوی)

(۱)

مرے تاریک ماضی کے وہ آنسو دل دکھاتے ہیں
کبھی دھندلے تصور میں جو آکر جھلملاتے ہیں
شعاعیں عید کی پھیلیں اِدھر دنیا کے ظاہر پر
اُدھر تاریکیاں طاری ہوئیں روحِ مسافر پر
تجمل ہنس رہا تھا چہرۂ ہستی پہ غازہ تھا
مرے دوشِ ضعیفی پر جوانی کا جنازہ تھا

یہ قبل از وقتِ محشر ہے کہ میری آپ بیتی ہے
مری وہ جس کو جینا تھا، جسے مرنا تھا، جیتی ہے

(۲)

حریر و پرنیاں پہنا، کسی نے گلبدن پہنا
مگر اس روز مرحومے نے کافوری کفن پہنا
کھلونے یاد کرتے ہیں ترے معصوم کھیلوں کو
میں کیسے زندگی بخشوں ترے مرحوم کھیلوں کو
مرے اجزائے ہستی ربط سے شرمائے جاتے ہیں
مذاقِ زندگی سے خود بخود گھبرائے جاتے ہیں
یہ قبل از وقتِ محشر ہے کہ میری آپ بیتی ہے
مری وہ جس کو جینا تھا جسے مرنا تھا جیتی ہے

قہقہے

نذرِ "ع"

(حضرتؔ نورؔ بجنوری)

جگمگاتے ہوئے سکوں کا سہارا لیکر
جب ہوس کارِ جوانی پہ ستم ڈھاتے ہیں۔
شب کی مغموم حسینہ کے پُراسرار آنسو
اوس بنکر رُخِ ہستی پہ بکھر جاتے ہیں
جب سسکتی ہوئی شمعوں سے دھواں اُٹھتا ہے
قصرِ ناہید کے انوار بھی تھرّاتے ہیں
زندگی شدّتِ احساس سے چلّاتی ہے
ذہنِ مفلوک میں کچھ ناگ سے بل کھاتے ہیں

جب مئے زر سے چھلکتے ہیں شیاطیں کے ایاغ
ٹمٹماتے ہیں بھڑکتے ہیں مساجد کے چراغ
قہقہے اُٹھتے ہیں ابلیس کے ایوانوں سے
قہقہے۔ جن سے جھلس جاتا ہے یزداں کا باغ
اسی سہمے ہوئے ماحول سے ٹکراتا ہے
ایک شاعر کا جنوں ایک مفکّر کا دماغ
ناگہاں تم مری آنکھوں میں چلی آتی ہو
کاکلِ عزم فشاں دوش پہ بکھرائے ہوئے
لبِ لعلیں پہ تبسّم کی سنہری کرنیں
پرچمِ زلف عجب ناز سے لہرائے ہوئے
میرے شاعر، مرے محبوب بڑھا چل یونہی
دیکھ ہیں سامنے آثارِ سحر چھائے ہوئے
خون بن کر مری رگ رگ میں یہ رنگیں الفاظ

دوڑتے پھرتے ہیں بہکے ہوئے اٹھلائے ہوئے

دل کے ہر زخم میں اک ٹھنڈ سی پڑ جاتی ہے
ناامیدی کی ہر اک بات بگڑ جاتی ہے
میری آنکھوں سے ٹپکتا ہے وہ افسوں اُس دم
سحر میں محفلِ ابلیس جکڑ جاتی ہے

دفعتہً تم مری آنکھوں سے چلی جاتی ہو
اور مرے عزم کی دنیا بھی اُجڑ جاتی ہے
چند آنسو مری آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں
چند نشتر مرے سینے میں کھٹک جاتے ہیں
قہقہے اُٹھتے ہیں ابلیس کے ایوانوں سے
قہقہے۔ جن سے کئی قلب دھڑک جاتے ہیں

ہنگامی ملاقات

(حضرت صبا متھراوی فاضل ادب)

"قیامت کا دن تھا ملاقات کا دن"

وہ حسنِ مجسم، وہ کیفِ سراپا
سمن زارِ حسرت، بہشتِ تمنّا
نگاہوں کا مرکز خیالوں کا کعبا
محبّت کے سجدوں سے شرما رہا تھا

وہ نظروں میں کھوئی ہوئی سی کہانی!
تڑپتی محبت، مچلتی جوانی!
نگاہوں نے ہر چند کی ترجمانی!
مگر جان کر بھی حقیقت نہ جانی!

وہ باتوں ہی باتوں میں پیہم کنائے
محبت کے شکوے زباں پر نہ آئے

دلوں کے تقاضے بمشکل چھپائے
نہ وہ لب پہ لائے نہ ہم لب پہ لائے!

وہ رسمی نوازش وہ رسمی تکلّم
قیامت تھا ٹوٹے دلوں کا تبسّم
بدقّت کیا جذبِ غم کا تلاطم
رہے وہ بھی چپ چپ رہے ہم بھی گم سم

محبّت ادھر پاؤں پھیلا رہی تھی
اُدھر مصلحت ہاتھ کھچوا رہی تھی!
طبیعت تو رونے پہ منڈلا رہی تھی
مگر احتیاطاً ہنسی آ رہی تھی

جھجھک تھی کچھ اپنے سوالات میں بھی
حیا تھی کچھ ان کے جوابات میں بھی
تلاطم تھا برپا خیالات میں بھی
جدائی تھی پیدا ملاقات میں بھی

قیامت کا دن تھا ملاقات کا دن

اے دوست! مجھکو طعنۂ ترکِ وفا نہ دے

وجہِ حیاتِ شوق تری یاد ہے ابھی
سینہ ہجومِ درد سے آباد ہے ابھی
باقی ابھی ہے جذبۂ بے اختیار بھی
ہے سجدہ گاہِ شوق تری رہ گزر بھی
اُمید و آرزو کے ہیں شام و سحر وہی
ہے اضطرابِ پیہم و دردِ جگر وہی
مایوس تو نہیں ہوں ترے التفات سے
مجبور ہو گیا ہوں مگر واقعات سے

اے دوست مجھکو طعنۂ ترکِ وفا نہ دے

تاریک ہوگئی ہے فضا کائنات کی
دُشوار ہوتی جاتی ہیں راہیں حیات کی
آؤں گا ایک روز تری بارگاہ میں
کانٹے ابھی بہت ہیں محبّت کی راہ میں
ماحول کو میں اپنے موافق بنا تو لوں
تاریکیوں میں راہ کی دیپک جلا تو لوں
کرنے دے تار تار یہ پردے سماج کے
کانٹے ہٹا تو لینے دے رسم و رواج کے
اے دوست! مجھکو طعنۂ ترکِ وفا نہ دے

حضرت کیفی جام پوری

اپنے دن اور اپنی راتیں

خونیں ہے آکاش کی رنگت دھرتی تھر تھر کانپ رہی ہے
دولت کی دیوی راہوں میں سینہ پکڑے ہانپ رہی ہے
بندوقیں کاندھوں پہ رکھ کر باغی ہر سو گھوم رہے ہیں
اونچے اونچے میناروں پر سرخ پھریرے جھوم رہے ہیں
زندانوں کی دیواروں کو توڑ دیا ہے دیوانوں نے
انسانوں کے آگے جھکنا چھوڑ دیا ہے انسانوں نے
چاروں جانب پھیل رہا ہے خون کے فواروں کا منظر
خون کے فواروں کا منظر پہلے انگاروں کا منظر
آگ کے شعلے خون کے چھینٹے تیر رہی ہیں سرخ فضائیں
چیخوں کا طوفان بپا ہے بھڑ بھڑ کرتی گرم ہوائیں

جھونپڑیوں نے اونچے ایوانوں کی گردن توڑ کے رکھدی
مظلوموں نے ظالم انسانوں کی گردن توڑ کے رکھدی
بھوک کے ماروں کی رگ رگ میں آگ کے طوفان جاگ اٹھے ہیں
فطرت جن پر نازاں ہے وہ کامل انساں جاگ اٹھے ہیں
مزدوروں کی آنکھوں میں ہیں گرمی تحریروں کے فقرے
شہر بانوں میں دوڑ رہے ہیں خونی تقریروں کے فقرے
اُبھرے شانوں والے دہقاں شہروں میں چنگھاڑ رہے ہیں
زرداری کے سینے پر افلاس کا پرچم گاڑ رہے ہیں
باغی انسانوں کا لشکر شاہی ایوانوں کو دوڑا
ہاتھوں میں ہے پرچم، پرچم پر ایک درانتی ایک ہتھوڑا
دوشیزائیں بک نہ سکیں گی عصمت اب نیلام نہ ہوگی
بھوکی بیواؤں کی عزّت زرداروں پر عام نہ ہوگی
کالی آنکھیں نیلی آنکھوں کے آگے اب جھک نہ سکیں گی
سرمایہ کی گیسوں سے مزدوروں کی سانسیں رک نہ سکیں گی

مزدوروں کے سر پر اینٹوں کو ترجیح نہ دی جائیگی
ابھرے شانوں چوڑے سینوں کی توہین نہ کی جائیگی
باتوں پر اب قید نہ ہوگی لب سینے کا حکم نہ ہوگا
بھورے رنگ کی مورت کو سائے میں جلنے کا حکم نہ ہوگا

آج سے جیون اپنا ہوگا اپنے دن اور اپنی راتیں
میٹھی بولی، مست ترانے، اُتم نغمے، سُندر باتیں

الطاف مشہدی

جہاں کے سرد و گرم کے مزاجداں بڑھے چلو
ہیں ابر و باد و برق تم سے سرگراں بڑھے چلو
بدل رہا ہے کائنات تیوریاں بڑھے چلو

۲

کھلی ہے آنکھ عقل کی نہ نیند ہے نہ خواب ہے
یہ دیکھو آفتاب ہے، وہ دیکھو ماہتاب ہے
بلا رہی ہے دور سے بلندیاں بڑھے چلو

۳

بڑھائے جاؤ زندگی کی وسعتیں بڑھے چلو
گرائے جاؤ ممکنات کی حدیں بڑھے چلو
بنائے جاؤ آسماں پہ آسماں بڑھے چلو

۴

جلاؤ چاند کا دیا عمل کی بارگاہ میں
بچھاؤ بادلوں کا فرش زندگی کی راہ میں
اڑاؤ دامنِ ہوا کی دھجّیاں بڑھے چلو

۵

یہ بحر کیا، یہ لہر کیا، یہ اوج کیا، یہ فوج کیا
تمہارے من کی موج میں سمندروں کی موج کیا
سمندروں سے چھین لو روانیاں بڑھے چلو

۶

اٹھان ہو دباؤ میں، وقار ہو جھکاؤ میں
گھماؤ میں، چڑھاؤ میں، ندی کے اس بہاؤ میں
اٹھائے اپنی کشتیوں کا بادباں بڑھے چلو

۷

حقیقتیں زمین کی ہیں گردِ آستین کی

ابھر رہی ہیں نقش پائے منزلیں یقین کی
اتر رہی ہیں طور سے تجلیاں بڑھے چلو

۸

بہاریں راستے کی دیکھتے ہوئے چلو چلو
حقیر سا سمجھ کے ان کو پھینکتے ہوئے چلو چلو
یہ فطرت بشر کی ہیں شوخیاں بڑھے چلو

۹

ہو تازہ اپنے رنگ میں نیاز اپنی وضع پر
ملے جو چاند سے گرے پتنگ شمع پر
تم ان لطیف شعلوں میں نغمہ خواں بڑھے چلو

۱۰

رواج اپنی قید میں دلوں کو گھیرتا رہے
خرد سمیٹتی رہے، جنوں بکھیرتا رہے
مگر تم اپنی دھن میں سب سے سرگراں بڑھے چلو

۱۱

جلو میں عہد رفتہ کی جوانیاں لئے ہوئے
عروج کی، زوال کی کہانیاں لئے ہوئے
حکایتوں، روایتوں کے درمیاں بڑھے چلو

۱۲

جھکے نہ سر بڑھے چلو، رکے نہ دل بڑھے چلو
کہ منزلیں ہیں پاس منزلوں سے متصل بڑھے چلو
قدم قدم پہ ہو رہا ہے امتحاں بڑھے چلو

۱۳

نشیب کیا، فراز کیا، خلیج کیا جبال کیا
اصول دین و دہر کیا، قیود ماہ و سال کیا
یہ بیڑیاں ہیں، بیڑیاں ہیں بیڑیاں، بڑھے چلو

۱۴

ممانعت کی قید کیا، مخالفت کا زور کیا

یہ آندھیوں کی چیخ گیا، یہ زلزلوں کا شور کیا
یہ دھمکیاں ہیں دھمکیاں ہیں دھمکیاں بڑھے چلو

۱۵

یہ حکمتیں یہ قدرتیں نظر کی میہماں ہیں
تجلیاں فریب ہیں، ترقیاں گماں ہیں
ابھی دیارِ وہم میں ہے کارواں بڑھے چلو

۱۶

بھرا ہوا ہے آنکھ میں ابھی غبار راہ کا
ابھی حدودِ رنگ میں ہے قافلہ نگاہ کا
ابھی حجاب حسن کا ہے درمیاں بڑھے چلو

۱۷

ابھی تو لذتوں میں گم ہیں قوتیں شعور کی
ابھی تو عقل ہے کنیز شوق ناصبور کی
ابھی تو عشق ہے خودی پہ حکمراں بڑھے چلو

۱۸

ابھی حیات مانگتی ہے بھیک آفتاب سے
ابھی تو خاک لے رہی ہے زندگی سحاب سے
ابھی تو یہ زمیں ہے زیرِ آسماں بڑھے چلو

۱۹

نہ اقتدار ابر پر، نہ اختیار باد پر
نہ رحم ہے نبات پر، نہ لطف ہے جماد پر
ابھی الوہیت کی منزلیں کہاں بڑھے چلو ۱؎

۲۰

بلند تر ہو قدسیت کے پایۂ جلیل سے
نگاہ جبرئیل سے، تصورِ جمیل سے
پرے ہے عرش سے تمہارا آشیاں بڑھے چلو

۱؎

مسرت خونِ دل گرما رہی ہے
نظر سے بجلیاں چمکا رہی ہے
خرد پر بیہوشی سی چھا رہی ہے
طبیعت خود بخود گھبرا رہی ہے
گئی طفلی جوانی آ رہی ہے

برستے ہیں ہر اک رگ سے شرارے
لرزتے ہیں نگاہوں میں ستارے
جگر میں ٹیس اور دل میں طرارے
تبسم ریز ہونٹوں کے کنارے
جوانی عشق کے گن گا رہی ہے

کہانی ہر ادا غمزہ فسانہ

تبسّم ہے کہ اک دلکش ترانہ
تخیّل میں ہے جدّت شاعرانہ
جھکا جاتا ہے قدموں میں زمانہ
امنگوں پر جوانی آرہی ہے

اداؤں میں تکلّف کی جوانی
تکلّف میں غرورِ زندگانی
غرورِ زندگی میں کامرانی
حدیثِ دل تبسّم کی زبانی
جوانی پر جوانی چھا رہی ہے

جبینِ نور ہے یا ساقِ سیمیں
یہ آنکھیں ہیں کہ جامِ کیف آگیں
شفق انداز ہیں لبہائے لعلیں
بہارِ صبحِ گلشن روئے رنگیں
جوانی رنگ و بو برسا رہی ہے

تکلم میں نہیں کہنے کے انداز
سمٹتی جا رہی ہے دل کی آواز
خموشی وہ بھی ہم آہنگ صد راز
سراپا سوز میں ڈوبا ہوا ساز
حیا شوخی پہ قبضہ پا رہی ہے

بظاہر اک سکوں اور دل میں ہل چل
سرکنا سر سے وہ رہ رہ کے آنچل
بہک جانا نگاہوں کا ہر اک پل
چھپانے پر عیاں شوخی کے کس بل
جوانی کسمسائی جا رہی ہے

وہ ڈرنا اپنی ہی پرچھائیوں سے
جھجکنا اپنی ہی انگڑائیوں سے

حیا خود اپنی ہی رعنائیوں سے
وہ خود مرغوب خود آرائیوں سے
نگاہ شوخ بھی شرما رہی ہے

یہ نیچی نیچی شرمیلی نگاہیں
بغل گیری پہ مائل نرم باہیں
کہیں ملتیں انھیں رنگیں نباہیں
وہ دھیمی سسکیاں وہ سرد آہیں
خودی پر بیخودی سی چھا رہی ہے

حضرت رونق دکنی سیمابی
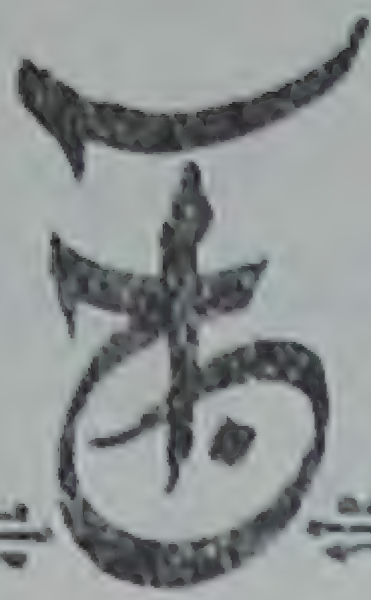
سورج نکلا
ہوا اُجالا

چاند چُھپا، ہر چھپ گئے تارے
میدان چھوڑ کے بھاگے سارے

سونے والے
جاگے، اُٹھے

بچّے، بوڑھے، گورے، کالے
سب نے اپنے کام سنبھالے

جاگی دُنیا
بھاگی دُنیا

ٹھیکیں اُونچی نیچی راہیں

۱۳۹

پھیلا دیں گردوں تک باہیں

تو سوتا ہے،
کیا ہوتا ہے

بھوک ہے تیرے پاؤں میں بیڑی
بھوک ہے تیری وجہ اسیری

بھوک مٹا دے
روح جگا دے

سیکھ کہ جینا کیا ہوتا ہے
بھول جو ہنستا ہے روتا ہے

رات سے پہلے
ہمت کر لے

آج تجھے قسمت ہے بدلنا
آج ہے امیدوں کو پھلنا

ضیا فتح آبادی ایم اے

ماں

میکدۂ مئے سرور ہے تری چشم سادہ بھی
مہرِ نشاط کی کرن بھیگی ہوئی نظر تری
حسنِ تبسّم لطیف صحنِ حرم کی چاندنی
لطفِ تکلّم خموش روحِ بتانِ آذری
بابِ بہشت در بغل حسنِ کنار دل کشا
حاملِ جنّت بریں خاکِ زمینِ زیرِ پا
لذّت جوہرِ نبات رکھتی ہے تیری بات بات
جنبشِ جاں فزائے لب موجۂ چشمۂ حیات
سایۂ عاطفت ترا سایۂ بالِ جبرئیل
رحمتِ خاص ذوالجلال تیری محبت جمیل

جلوہ نقشِ پا نزا شمعِ حریمِ زندگی
مشعلِ جادۂ نجات حسنِ خرامِ سرمدی
ہستئ انس و جاں سے ہے باغ و بہارِ کائنات
ہستئ انس و جاں کی ہے وجہ بہار تیری ذات
تیرا وجودِ نغمہ زا مطربِ بزمِ سازِ زیست
تیرے نفس سے منسلک سلسلہ درازِ زیست

گرچہ نہیں ہے تیری ذات خالقِ روح و کائنات
پھر بھی ہے خالقِ مجاز یعنی ذریعۂ حیات

عبدالمجید برقؔ صدیقی فتحپوری

نظامِ نو

چاندی کے روپہلے سکوں کو قرطاس پہ ڈھالا جاتا ہے
پانی کے بدلے پیاسوں کو تیزآب پلایا جاتا ہے
اندھیر ہے اور اندھیر ایسا۔ دنیا کے پرستش خانے میں
ہر کوہ کو پوجا جاتا ہے ہر کاہ کو روندھا جاتا ہے
ہر بات پہ کھاتا ہے ملّا ایمان کی قسمیں جھک جھک کر
مومن کی جگہ قرآن یہاں ابلیس کو سونپا جاتا ہے
مزدور کی آنکھوں کے حلقے بنتے ہیں امیروں کی عینک
احساس کے میلے پردوں پر یہ کھیل بھی کھیلا جاتا ہے
بیواؤں یتیموں پر طنز و تشنیع کی ہوتی ہے بارش
جب مرتے نہیں یہ فاقوں سے باتوں سے مارا جاتا ہے

یہ جبر و تشدد کچھ نہ رہے یہ ظلم و ستم سب مٹ جائیں
اک ایسا نظامِ نو بزمِ عالم میں مُرتّب کرنا ہے

یہ دیر و حرم، یہ کفر اور دیں، تفریق بداماں ہیں دونوں
دنیا کے لئے بھی وجہِ الم اور خود بھی پریشاں ہیں دونوں
ناقوس کی لَے بھی اک دھوکا، اور لحنِ اذاں بھی اک دھوکا
عرفان کہاں انہیں یعنی اک سازِ غلط خواں ہیں دونوں
زنّار برہمن کی ہو یا تسبیح ہو شیخِ کعبہ کی
خود کاہی اور خود کامی کا اک حربۂ عریاں ہیں دونوں
تثلیث کدے کی حوریں ہوں، یا دیرو شوالہ کی پریاں
تہذیبِ بنی آدم کیلئے فولاد کی چھُریاں ہیں دونوں
مخلوقِ خدا کی خدمت سے پرہیز ہے دونوں قوموں کو
مفہومِ عبادت سے ناواقف گبر و مسلماں ہیں دونوں

ہو انکا نہ جسمیں دخل و گزر، ہو انکا نہ جسمیں نام و نشاں
اک ایسا نظامِ نو بزمِ عالم میں مُرتّب کرنا ہے

تبلیغِ مذاہب بھی ناقص ترویج سیاست بھی ناقص
جب دل ہی پر اخلاص نہیں خالق کی عبادت بھی ناقص
دونوں ہی فریبی بندے ہیں، محرومِ صداقت ہیں دونوں
واعظ کی روایت بھی باطل، لیڈر کی حکایت بھی ناقص
گلزار میں بھی آرام نہیں اور کُنجِ قفس بھی غم پیرا
کمزور نشیمن بھی اپنا، زنداں کی عمارت بھی ناقص
جینا بھی گوارا ہم کو نہیں اور موت بھی اپنے بس میں نہیں
ہے زیست کی حسرت بھی مہمل مرنے کی جسارت بھی ناقص
ہر روز کی خانہ جنگی سے لاحول کے قابل ہے دُنیا
صحرا میں بگولے اٹھتے ہیں گلشن کی سکونت بھی ناقص

ہو عیش و مسرت عام جہاں ہو تسکیں و آرام جہاں
اک ایسا نظامِ نو بزمِ عالم میں مرتب کرنا ہے

ہر پھول کی پیشانی پر ہوں انوار و تبسم کی لہریں
ہر خار میں پر تو ہو گل کا ہر گلبن تکلم کی لہریں
ہر برگ کے سینے پر ہو رقم روداد بہاران رنگیں
ہر شاخ لچک کر پیش کرے الطاف و ترحم کی لہریں
ہر وقت نسیم روح فزا اک راگ الاپے عشرت کا
ہوں بادِ صبا کی موجوں میں مستانہ ترنم کی لہریں
سورج کی کرن کا منہ شبنم ہر صبح دھلائے گلشن میں
معدوم ہوں ہر اک گوشے سے تفریق و تصادم کی لہریں
ہر سانس پہ ہو عرفانِ دل کا ہر ایک نفس ہو حق آگہ
اس درجہ یقیں کی بارش ہو بہہ جائیں توہم کی لہریں

ہو جس میں رضائے بندہ بھی مولیٰ کی مشیت بھی شامل
اک ایسا نظامِ نو بزمِ عالم میں مرتب کرنا ہے

طرفہ قریشی

"رنگین رسالے"

اردو کے یہ رنگین و دل آویز رسالے
سینے میں ادب کے ہیں ٹپکتے ہوئے چھالے
معصوم جوانوں کا لہو چاٹنے والے

ڈوبی ہوئی زہراب میں تحریر ہے انکی
پھولوں میں چھپائی ہوئی شمشیر ہے انکی

اک آگ برستی ہے فسانوں کی فضا سے
سمجھے ہوئے "امرت" ہیں حسن و عشق کے پیاسے
اخلاق کا گھر خاک میں ملتا ہے بلا سے

یہ بیٹی اشاعت کو بڑھاتے ہی رہیں گے
یہ وان گناہوں کو چڑھاتے ہی رہیں گے

احساس یہ بجلی سی گراتی ہیں تصاویر
ہر نقش حیا دل سے مٹاتی ہیں تصاویر
انسان کو "ناکارہ" بناتی ہیں تصاویر

مذموم خیالات کی یہ سلسلہ بندی
کردار میں کس طرح سے پیدا ہو بلندی

اس دور میں ہیں رونقِ بازار ہزاروں
نافہم و بداندیش و غلط کار ہزاروں
دس بیس نہیں ان کے خریدار ہزاروں

اصلاح کی خاطر نہ تجارت کیلئے ہیں
یہ خانہ خرابی کی اعانت کیلئے ہیں

آوارگیٔ فکر ہوئی عام انھیں سے
آداب شرافت ہوئے بدنام انھیں سے

پھیلا ہے مذاقِ ہوسِ خام انھیں سے

اوروں کی تباہی سے بھریں اپنا خزانہ

کیا خوب ہے کہ یہ "خدمتِ اردو" کا بہانہ

مقصد، ادب و شعر و صحافت میں اضافہ

نوخیز جوانوں کی مسرت میں اضافہ

کرتے ہیں مگر مل کے "یہ لعنت" میں اضافہ

جس کام میں تخریب ہو وہ کام برا ہے

نیت، جو بھلی بھی ہو، تو انجام برا ہے

اشعار میں عریانیٔ جذبات کہاں تک

شاعر کا قلم، محوِ خرافات کہاں تک

آوارہ مزاجوں کی حکایات کہاں تک

مقبول جو یوں نکبت و پستی کا چلن ہو

ممکن ہے، کہ آزاد غلامی سے وطن ہو؟

اردو کے یہ رنگین و دل آویز رسالے

سینے میں ادب کے ہیں ٹپکتے ہوئے چھالے

معصوم جوانوں کا لہو چاٹنے والے

ڈوبی ہوئی زہراب میں تحریر ہے ان کی

پھولوں میں چھپائی ہوئی شمشیر ہے ان کی

ادیب مالیگانوی

تلاش

(احمد عظیم آبادی)

اور بھی کچھ تری قسمت میں ہے رونے کے سوا
لاگ کی آگ کو پانی میں ڈبونے کے سوا

اور بھی کچھ ترے سینے میں ہیں جلتے نغمے
آتشیں نے کو ان آہوں میں سمونے کے سوا

اور بھی کچھ ترے گلشن میں ہیں تازہ کلیاں
رشتۂ شعر میں شکووں کو پرونے کے سوا

اور بھی کچھ ہے تری لوحِ جبیں میں مضمر
مائل سجدہ درِ ناز پہ ہونے کے سوا

اور بھی کچھ ترے آغوشِ جنوں میں دم ہے
سایۂ زلفِ سکوں ریز میں سونے کے سوا
اور بھی کچھ ترے باہوں میں ہیں کس بل باقی
کشتیٔ زیست کو طوفاں میں ڈبونے کے سوا

گر ہمیں مقصدِ عمر است بہ یزداں بہ فگن
بسکہ ایں شرمِ حیات است نہ قبر و دفن

کاخِ بلند کا ایک صفحہ

تماشا گرِ خودی کے یہ تحیّر خیز نظارے
کبھی مومن ہے منبر پر کبھی ہے بر سرِ دارے

مکاں سے لامکاں تک حُسن کی ہے کارفرمائی
اسیرِ سحرِ مومن ہیں ثوابت ہوں کہ سیّارے

کبھی مومن کے عالی ظرف میں تو نے کمی پائی
مُسلسل آگ برسی اِسپہ اور پیہم چلے آرے

تری عزلت گزینی سے حوادث رک نہیں سکتے
مجاہد ہیں ازل سے غمزۂ تقدیر کے مارے

بہت ہی پست ہے سطحِ مذاقِ اوجِ کہسار ان
نہ ہے پروازِ شاہینی دمِ مرغِ نوگرفتارے

ہزیمت سے نہ ڈر غافل صف آرائی میں نصرت ہے
مشیت کا نہیں منشا کہ تو میدان میں ہارے

کسی سے بھی نہ یہ سحرِ فرنگی آج تک ٹوٹا
خرد نے کھیل بھی کھیلے جنوں نے زور بھی مارے

فلک صدیوں سے گردش میں ہے اے صدیوں کے زندانی
مگر چمکے نہیں اب تک تری تقدیر کے تارے

وہ ارض تاج ہو سسلی ہو اندلس ہو کہ دہلی ہو
کھنڈر یہ سب تری تہذیب ماضی کے ہیں گہوارے

زمانے بھر کی شطرنج سیاست کھیلنے والے
بساطِ ہند کی بازی اگر ہارے تو کیا ہارے

کوئی صرصر کو دے پیغام بجلی سے کوئی کہہ دے
مری نمناک مٹی میں ابھی پنہاں ہیں انگارے

ترا در چھوڑ کر تو ہی بتا دے اب کدھر جائیں

یہ تیغ ناز کے بسمل یہ سوزِ درد کے مارے

زہے یہ گوہر لرزاں جو چشم حسن سے نکلے

زہے یہ اشک ہائے غم یہ میرے دل کے شہپارے

خداوندا یہ ابن نوحؑ بھی منصورؒ بن جائیں

اگرچہ قطرۂ شبنم نہ پاید بر سر خارے

"منم آں قطرۂ شبنم بہ نوکِ خار می رقصم"

حکیم عبدالکریم ثمر (لاہور)

نقوشِ ماضی

از وجدی الہ آبادی

اب بچھڑے ہوئے دل کو کہاں سے لاؤں
کھوئی ہوئی منزل کو کہاں سے لاؤں
اب عشق کی موجوں میں نہیں حسنِ کشش
سمٹے ہوئے ساحل کو کہاں سے لاؤں

(۲)

وہ سازِ خوش آثار کہاں سے لاؤں
وہ نغمۂ سرشار کہاں سے لاؤں
بکھرے ہوئے غم کو جگا دیتی ہے
وہ فطرتِ بیدار کہاں سے لاؤں

۳

نظاروں کا پیغام کہاں سے لاؤں
وہ دورِ مئے و جام کہاں سے لاؤں
بکھرے ہوئے چہرے پہ وہ بکھری ہوئی زلف
اب وہ سحر و شام کہاں سے لاؤں

۴

وہ نغمہ فسانہ ساز کہاں سے لاؤں
وہ حسن وہ آواز کہاں سے لاؤں
وہ عرش کی تسخیر کا معصوم عمل
وہ سحر وہ اعجاز کہاں سے لاؤں

(۵)

وہ عشق کے اسرار کہاں سے لاؤں
وہ زیست کے غم خوار کہاں سے لاؤں
غم جس کو سمجھتی ہے بظاہر دنیا
وہ یارِ وفادار کہاں سے لاؤں

آبِ حیات

اقبال ماہر (الہ آبادی)

مجھکو معلوم ہے افسانۂ آبِ حیواں
خواجگی دیتی ہے کس کو ابدیت کا فریب

دائمی درد لئے ساغرِ عشرت ساماں
دے رہا ہے وطنیت کو مسرت کا فریب

❊

آنکھ میں نور نہیں جسم میں احساس نہیں
نظر آتا ہے بڑے درد سے تارِ ہستی

زندگی راس نہیں موت کی بھی آس نہیں
مضمحل سانس پہ اب تک ہے مدارِ ہستی

❊

زندگی کا یہ سسکتا ہوا مردہ سا نظام
جس کے انجام کو آغاز بنایا نہ گیا

آج وہ بار اٹھاتے ہیں سکندر کے غلام
خود سکندر سے بھی جو بار اٹھایا نہ گیا

❊

آبِ حیواں ہے وہی پھر بھی پئے جاتے ہیں
خواہشِ زیست نہیں اور جئے جاتے ہیں

رُسوائی

سیّد فیض الحسن فیضی

پروانے کی نگاہ میں رقصاں تھا ایک راز
یہ راز قیدِ راز میں رہتا تو خوب تھا
لیکن ـ ضیائے شمعِ غم افزوں، نہ پوچھئے
پروانہ جل مرا!!
ذرّے کی آفتاب کے آگے بساط کیا؟
اک عالمِ عدم تو جہانِ ظہور ایک
لیکن ـ ظہورِ مہر کا شبخوں، نہ پوچھئے!
ذرہ نکھر گیا!!

میں نو نیاز وقفِ ستم ہائے ناز تھا
میری نگاہ میں بھی تقاضائے راز تھا
لیکن — وہ شامِ مرگ کا افسوں، نہ پوچھیے
آنسو ڈھلک پڑا!!
پروانہ جل مرا!!

مانا طلوعِ مہر سے ذرہ نکھر گیا
لیکن یہ راز، راز ہی رہتا تو خوب تھا

"میں اور تو"

(عارف سیال کوٹی)

میں ننگِ تمنا ہوں، تو جانِ تمنا ہے
میں نقصِ تماشا ہوں، تو حسنِ تماشا ہے

میں مصرعِ مہمل ہوں، تو شعر سراپا ہے
میں قصۂ بے معنی، تو نظمِ دل آرا ہے

بیکار مری ہستی، ہے حاصلِ ہستی تو
میں برگِ فسردہ ہوں، تو پھول شگفتا ہے

لذت کشِ زحمت میں، تو حاصلِ صد راحت
میں آنکھ کا کانٹا ہوں، تو آنکھ کا تارا ہے

میں غم کا مرقع ہوں، تو مستِ خود آرائی
اک میں کہ بہت عاجز، اک تو کہ خود آرا ہے

میں طالبِ پیمانہ، میخانہ بدامن تو
بے کیف مری ہستی، تو کیف کی دنیا ہے

میں صورتِ پروانہ، تو غیرتِ شمع تو
میں سوزِ مجسّم ہوں، تو سازِ سراپا ہے

ہے زرد مرا چہرہ، اور کانِ ملاحت تو
بیزار جہاں مجھ سے، عالم ترا شیدا ہے

آوارۂ منزل میں، آسودۂ منزل تو
میں راہ سے ناواقف، تو رہبرِ دنیا ہے

میں خاک کا تودہ ہوں، اور نور کا پیکر تو
پتھر سے بھی میں کمتر، تو گوہرِ یکتا ہے

اُف کتنا تفاوت ہے ہم دونوں کی ہستی میں
دنیا کیلئے میں ہوں، تیرے لئے دنیا ہے

کرشن جی
کی
بانسری

طالب کاشمیری

دیکھو وہ شیام سندر مرلی بجا رہے ہیں ـــ!
رس راگ کے کرشمے کیا کیا دکھا رہے ہیں
کس کس ادا سے میٹھے نغمے سنا رہے ہیں
رنگیں نوائیوں کی گنگا بہا رہے ہیں
جنبش سے موجِ لب کی طوفاں اٹھا اٹھا کر
خاموشیٔ فضا میں ہلچل مچا رہے ہیں

شاداب وادیوں میں خوابیدہ بستیوں کے
سنسان جنگلوں میں آوارہ ہستیوں کے
عالم میں بیخودی اور بیدار مستیوں کے
بالا بلندیوں سے نزدیک پستیوں کے

نیر سنگئے جہان کے فتنے جگا جگا کر
سوز و گداز بن کر دنیا پہ چھا رہے ہیں

چھن چھن کے آرہی ہیں من موہنی صدائیں
اٹھ اٹھ کے جھومتی ہیں بکھری ہوئی گھٹائیں
انگڑائیوں کے بس میں ہیں رس بھری ہوائیں
کروٹ بدل رہی ہیں سوئی ہوئی فضائیں

آواز دور رس ہیں گرد و سما سما کر
مثلِ صدائے گنبد چکر لگا رہے ہیں

اپنے خیال بھولے گئو ہیں، گوال سارے
پنچھی، ہرن، چکارے بھرنے لگے طرارے
اس زیر و بم میں گم ہیں جمنا کے دو کنارے
محوِ سرود دونو ہیں گوپال کرشن پیارے

پیالے سے جذب دل کے مے پریت کی پلا کر
دور و قریب سب کو متوالے بنا رہے ہیں

گانے لگا پپیہا حمدِ جنابِ باری —!
موروں کے شور میں ہے اندازِ غمگساری
طوطے کے بول میٹھے، کوئل کی کوک پیاری
ہنسی کے راگ سے ہے لیکن وہ وجد طاری
جس کے مقابلے میں گردن جھکا جھکا کر
شرم و حیا کے مارے وہ منہ کی کھا رہے ہیں

طنبورا اور دف ہیں اسبابِ جاں نوازی
تارِ رباب و بربط آہنگِ سحر سازی
سر جلترنگ کے ہیں وجہِ فسوں طرازی
لیکن نہیں ہے ان میں وہ شانِ امتیازی
چھپ چھپ کے جس سے نٹ ور جادو چلا چلا کر
عالم میں اپنے فن کا سکہ جما رہے ہیں

سکھیوں نے جھولے ڈالے سب جھولنے کو آئے
پینگیں بڑھا بڑھا کر ساون کے گیت گائے

آوازِ کرشن سُن کر حسرت کے تیر کھائے
ہوش ان کے لڑکھڑائے، اوسان ڈگمگائے
رنگ اور راگنی کی چھینٹیں اُڑا اُڑا کر
گھنشام بخلخہ خود ان کو سنگھار رہے ہیں
راگی نے مست ہو کر دلسوز راگ گایا
دھیانی نے دھن میں ہر کی چرنوں سے چت لگایا
گیانی نے گیان ورنن کرنے میں سکھ اٹھایا
لیکن کسی عمل میں ایسا مزا نہ پایا
چت چور جس ادا سے جنتا مٹا مٹا کر
پہلو میں ہر بشر کا دل گدگدا رہے ہیں
آکاش سے اچھل کر شمس و قمر ہیں رقصاں
روئے زمیں پہ کیا کیا شاخ و شجر ہیں رقصاں
پربت کی گودیوں میں سنگ و حجر ہیں رقصاں
موجوں میں پانیوں کی لعل و گہر ہیں رقصاں

ہر ذرّہ جہاں کو موہن نچا نچا کر

برہمانڈ راس منڈل اب بھی رچا رہے ہیں

اٹھی صدائے سرمد جس سے وہ نے یہی ہے

اور نعرۂ انا الحق کی اصل لے یہی ہے

جس نے امر بنایا میرا کو مے یہی ہے

تھی گوپیوں میں جس سے جھل بل وہ شے یہی ہے

اب بھی ہیں آپ ہی جو جلوے دکھا دکھا کر

مرکز کی سمت اپنے سب کو بلا رہے ہیں

اے دو جہاں کے مالک اے حُسنِ کبریائی

ارض و سما کے خالق، مختارِ کل خدائی

طالب کو بھی عطا کر وہ ذوق ہمنوائی

مٹنے نہ پائے جس سے یہ دردِ آشنائی

قدموں میں تیرے اپنی ہمت بڑھا بڑھا کر

ہم آہ! مدّتوں سے آنکھیں بچھا رہے ہیں

شیراز کی ایک رات

ناصر مالیگانوی

فضا شاداب ہے منظر درخشاں — شبستاں اور یہ حُسنِ شبستاں
مُصفّا چاندنی پھیلی ہوئی ہے — فلک پر جلوہ گر ہے ماہ تاباں
اِدھر ہیں "یاسمیں" کے پھول روشن — اُدھر تارے فلک پر ہیں درخشاں
ہزاروں رنگ کے بکھرے ہیں جلوے — ہزاروں رنگ کے ہیں ساز و ساماں
مسلسل ہو رہی ہے بارشِ کیف — ارے یہ منظرِ شعر و شبستاں
یہ "رکنا باد" کا ساحل نہیں ہے — بپا ہے ہر طرف نغموں کا طوفاں
لچک شاخوں کی گویا کہہ رہی ہے — ابھی بادِ بہاری ہے گُل افشاں
نکھر آئی ہے رنگت پتیوں کی — بھرا ہے حُسن سے پھولوں کا داماں
ٹپکتی ہے ہر اک شے سے بشاشت — چمکتی ہے عروسِ شب کی افشاں
منور چاندنی میں بام و در ہیں — جمال طور ہے جیسے فروزاں

فضا آئینہ بن کر رہ گئی ہے — شب مہتاب اور اتنی درخشاں

سجی ہے ایک رنگ و بو کی محفل — بسی ہے ایک فردوسِ درخشاں

یہاں کی صبح بھی ہے "صبح نوروز" — یہاں کی شام بھی ہے صبحِ خنداں

تعالی اللہ "خاکِ پاک شیراز" — یہ گلگشتِ "مصلّےٰ" یہ گلستاں

طبیعت سیر ہوتی ہی نہیں ہے

ہیں اس "نیرنگیٔ فطرت" کے قرباں

شریکِ حیات سے خطاب

آذر سرحدی

اے مرے خفتہ مقدّر کو جگانے والی
میری اجڑی ہوئی دنیا کو بسانے والی
تیرے دامن سے ہے وابستہ مرادامنِ تر
اے گلستانِ جوانی کے حسین پھول مگر
دل میں جو بات کھٹکتی ہے وہ کہنے دے مجھے
مصلحت یہ ہے کہ خاموش نہ رہنے دے مجھے
صاف کہتا ہوں میں اے شرم و حیا کی دیوی
دل جو میرا نہ ہوا وہ نہیں تیرا اب بھی
رسم شادی کو بھی اک لغزشِ مستانہ سمجھ
مردِ آوارہ کی اک جراتِ رندانہ سمجھ

جبتک اپنا نہ بنا لے مجھے اپنا نہ سمجھ
اپنا معبودِ مجازی ہنیں! بیگانہ سمجھ

اب بھی ہیں میری امنگیں مری جذبات جواں
کھیلتا ہوں میں بہاروں سے بہ ہنگام خزاں

اب بھی ہے ذہن میں سویا ہوا طوفانِ گناہ
اب بھی ہے میرے خیالات میں ہیجان گناہ

اب بھی ہے برفِ سرِ راہگذر مجھکو پسند
اب بھی ہے حسن کی ذر دیدہ نظر مجھکو پسند

اب بھی ہے میری نگاہوں میں حسینوں کا خیال
اب بھی تڑپاتا ہے راتوں کو گناہوں کا خیال

اب بھی ہے مجھکو ہوس رونقِ میخانہ بنوں
اتنی پی لوں نہ رہوں ہوش میں! دیوانہ بنوں

مضطرب اب بھی ہوں میں پینے پلانے کیلئے
ایک رقاصہ پر ایماں لٹانے کیلئے

حسنِ عریاں کا خیال آج بھی تڑپاتا ہے
قیصِ ساغر کے تصور میں مزا آتا ہے

وہ حسینوں سے ہم آغوشی میں بیتی راتیں
بادہ نوشی میں گذاری ہوئی بھیگی راتیں

بھول سکتا ہوں نہیں آج بھی وہ برساتیں
چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کے پرانی باتیں

اب تو چاہے تو نگاہوں میں وہ جادو بھر دے
غیر کا ہو نہ سکوں، بس مجھے اپنا کر دے

ہر ادا میں تری اک حسن ہو ایسا پیدا
دل سے احساس بھی مٹ جائے یہ ہستی کا

ذہن بیدار پہ اس رنگ سے تو چھا جائے
میرے جذبات کے طوفان کو نیند آ جائے

تیری آنکھوں میں ہو آسودہ بہارِ مستی
تیری پلکوں پہ کرے رقص حیا کی سُرخی

تیرے ہونٹوں پہ ہنسی آئے مگر شرماتی
ہر نظر ہو تری پیمانِ وفا دہراتی

تیری خاموش نگاہوں میں ہوں افسانے چند
ہر تبسم میں چھلکتے ہوئے پیمانے چند

تیرے ہر ناز میں شامل ہو محبت کا نیاز
تیرے دامن پہ ادا ہو مری الفت کی نماز

مشرقی آن نمایاں ترے کردار میں ہو
اک دلآویز حلاوت تری گفتار میں ہو

کفر ساماں ہو نگاہوں کیلئے تیرا شباب
حسن لیکن رہے وابستۂ آئینِ حجاب

باعثِ گرمیٔ محفل نہ بنے تیرا جمال
چشمِ اغیار سے پوشیدہ ہوں ترے خد و خال

تو ہے وہ شیزۂ مشرق کہیں بدنام نہ ہو
تجھکو تہذیبِ فرنگی سے کوئی کام نہ ہو

مرکزِ شرم ہے، سر چشمۂ عصمت ہے تو
یاد میں تجھ کو دلاتا ہوں کہ "عورت" ہے تو

تیرے ہاتھوں میں ازل سے ہے زمامِ ہستی
تو جو چاہے تو بدل جائے نظامِ ہستی

تیرے ہاتھوں میں ہے تہذیبِ وطن کا نشاں
تو ہو بیدار تو قوموں کی سیاست ہو جواں

تو نے آغوش میں پالے ہیں جوانانِ وطن
تو نے زانو پہ لٹائے ہیں شہیدانِ وطن

بارہا تو نے تڑپتے ہوئے لاشے دیکھے
خون میں اپنے نہائے ہوئے بیٹے دیکھے

مسکرائی بھی ہے آئینِ جفا کاری پر
خون روئی بھی ہے مظلوم کی ناچاری پر

تو نے یہ رنگ زمانے میں کئی دیکھے ہیں
خاک میں روندے ہوئے تاجِ شہی دیکھے ہیں

کیا ضرورت ہے کہ ہاتھوں میں قلم ہو تیرے
لطف تو جب ہے کہ ہاتھوں میں عَلَم ہو تیرے

تیرے سینے میں تڑپتے ہوئے ارمان نہ ہوں
آرزوؤں کے بپا قلب میں طوفان نہ ہوں

تیری گفتار میں پوشیدہ ہو اک برقِ تپاں
تیرے دل کو نہ ستائے خلشِ سود و زیاں

تیرے نعروں سے جوانانِ وطن جاگ اٹھیں
خاک کے ذرے بھی سینے میں لئے آگ اٹھیں

فکرِ فردا میں شب و روز پریشاں ہو تو
قومِ درماندہ کی تعمیر کا ساماں ہو تو

تو جئے ملک کی عزت پہ فدا ہونے کو
دین و ملّت کی محبت میں فنا ہونے کو
سرنگوں ہو ترے قدموں میں زمیں اور زماں
سربلندی تجھے حاصل ہو زمانے میں تو ہاں!

تب میں سمجھوں کہ تو شادی بکنار آئی ہے
تب میں جانوں مرے گلشن میں بہار آئی ہے

جلیل

جلیل حسن نام، جلیل تخلص، اور والد کا نام مولوی حافظ عبد الکریم ہے ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانکپور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید سے فراغت پائی۔ طالبعلمی کا بیشتر زمانہ لکھنؤ میں گذارا اور وہاں عربی و فارسی میں استعداد بہم پہونچائی

سخن گوئی کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ بیس سال کی عمر میں امیر مینائی کے سلسلہ تلمذ میں داخل ہوئے اور جملہ ضروریات و مستحسنات شعری حضرت امیر ہی کے فیضان صحبت سے حاصل کئے۔ رامپور میں امیر اللغات کی تدوین کے لئے دفتر کھل گیا تو اس کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ سفر بنارس و بھوپال وغیرہ میں بھی حضرت امیر ہمرکاب رہے۔ ۱۰ر جنوری ۱۳۱۸ھ کو استاد کے ہمراہ حیدرآباد پہنچے۔ اس زمانہ میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی اعانت اور مہمان نوازی شامل حال رہی۔ حضرت امیر کی وفات کے بعد ۱۳۲۷ھ میں غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام دکن نے اپنی استادی کا شرف بخشا اور داغ مرحوم کی جگہ پر مامور فرماکر "جلیل القدر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

حضور پر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع خلداللہ ملکہٗ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی استادی کے شرف سے مشرف فرمایا۔ اور پہلے "نواب نصاحب بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی ۱۹۱۲ء میں اعلیحضرت حضور نظام کو سلطان الشعراء کا خطاب دیا۔ جس کو قبول فرماکر دنیائے شعر و ادب کو عزت بخشی گئی۔

حیدرآباد سے دو رسالے "محبوب الکلام اور" دبدبہ آصفی" نکلتے رہے ہیں ایک مبسوط رسالہ تذکیر و تانیث الفاظ پر بھی تصنیف کیا ہے جو مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کے مقدمے کے ساتھ چھپ چکا ہے منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ تاج سخن پہلا دیوان، جو پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا۔

۲۔ جان سخن دوسرا دیوان، جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں طبع ہوا۔

۳۔ روح سخن تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے

۴۔ سرتاج سخن قصائد مداحیہ قطعات اور تاریخوں کا مجموعہ ہے

۵۔ معراج سخن نعتیہ کلام اور سلام وغیرہ کا مجموعہ ہے۔

۶۔ گل صد برگ رباعیات کا مجموعہ ہے۔

نثر کی تصنیفات یہ ہیں:۔

۱۔ معیار اردو۔ زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ۔
۲۔ سوانح امیر مینائی۔ جناب امیر مینائی کی سوانح حیات مع انتخاب کلام
۳۔ تعلیم الصلوٰۃ۔ دینیات کا ایک رسالہ۔

سیماب اکبر آبادی

عاشق حسین نام۔ سیماب تخلص اور والد محترم کا نام مولانا محمد حسین ہے جو اپنے وقت کے عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ علامہ سیماب ۱۸۸۰ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے علوم مشرقیہ کی تکمیل کے بعد ایف۔ اے تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ والد محترم کے انتقال کے بعد انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ شعر و سخن کا ذوق بہت کم عمر میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں جہاں استاد نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۲۰ء تک سرکاری دفاتر میں ملازم رہے اور اس کے بعد سے ابتک مستقلاً آگرہ میں قیام ہے گویا چھبیس سال سے اردو زبان و ادب کی ناقابل تردید خدمت فرما رہے ہیں حضرت سیماب نے اردو زبان ادب کی جتنی خدمت کی ہے اس کی مثال تاریخ اردو ادب میں نہیں ملتی! آپ نے اپنی ادارت میں متعدد اخبارات و رسائل جاری کئے آپ کی ایک سر

سے زیادہ تصانیف نظم ونثر منظر عام پر آئیں اور ابھی کئی گرانقدر تصانیف زیر طبع ہیں۔ جہاں تک علامہ سیاب کی شاعری کا تعلق ہے۔ ان چند سطور میں ان پر تبصرہ ناممکن ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ اس دور کے بے نظیر شاعر و ادیب ہیں اگر نظم نگاری میں اقبال اور جوش کے ہم پلہ ہیں تو غزل میں فانی حسرت۔ اصغر اور دیگر اساتذہ کی صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں ادبیات اردو میں آپ کی نثر نگاری مثالی حیثیت رکھتی ہے متعدد کتابیں نثر کی ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے مضامین اردو زبان وادب کا بڑا سرمایہ ہیں۔ آپ ہندوستان کی پہلی ہستی ہیں جو ادب کی تمام اصناف پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ صاحب طرز بھی ہیں۔ اردو زبان وادب میں جس قدر اجتہاد و اختراع سے آپ نے کام لیا دوسرے شاعر اور ادیب نے نہیں لیا۔ غزل کے نئے رنگ کے آپ موجد ہیں۔ غرض آپ کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی مخالفت میں سب سے زیادہ قلم فرسائی ہوتی ہے جیسے شہرت کا سودا ہوا اس نے آپ پر انتقامی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جو جتنا بڑا صاحب کمال ہوتا ہے اتنے ہی اس کے حاسد ہوتے ہیں بہرحال دیکھا یہ گیا ہے کہ ادبی حلقے تھوڑی سی چیخ و پکار کے بعد اور مخالفت کے بعد علامہ سیاب کی تحریکات و اجتہادات کی تقلید پر ضرور مجبور ہو گئے

علامہ سیاب کے کئی ہزار شاگرد ہیں اور ان میں سیکڑوں بجائے خود استاد ہیں یہ مع وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عصر حاضر کے اس جلیل القدر اور محترم شاعر نے حال کے علاوہ اردو ادب و شعر کے "مستقبل" کے لئے بہت بڑا کام کیا ہے۔

جگر

علی سکندر نام جگر تخلص وطن مراد آباد سنہ ولادت ۱۸۹۰ء انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی۔

غزل گوئی آپ کا فطری ذوق ہے۔ شاعری میں حضرت داغ، تسلیم۔ اصغر گونڈوی کا تلمذ حاصل کیا ہے۔

پڑھتے نہایت دلکش ہیں صرف غزل آپ کا میدان اور حصہ ہے۔ آپ نے علامہ اقبال ہی کی طرح شاگردوں کی علت نہیں پالی۔ آپ کے کلام پر اکثر انتقاد ہوتا رہتا ہے جو حقیقی معنی میں کلام کی زندگی کا ضامن ہے۔

آرزو

سید انور حسین نام آرزو تخلص ولادت ۱۸۸۹ء وطن لکھنؤ شاگرد رشید جناب جلال لکھنوی۔ آپ زیادہ تر خالص اردو میں شاعری کرتے ہیں بحر طویل میں

نہایت عمدہ کہتے ہیں۔ آپ کا کلام زہ سبک رو رہا ہے جس کو دیکھ کر اکثر انسان
کھو جاتا ہے۔ عربی فارسی کے الفاظ کا استعمال آپ کے یہاں نہ ہونے کے برابر
ہے آپ کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

یوں تو آپ کا اکثر کلام لوگوں کی زبانوں پر ہے لیکن یہ غزل
آرام کے تھے ساتھی کیا کیا جب وقت پڑا تو کوئی نہیں
آپ کی شاعری کا غیر فانی شاہکار ہے۔ آپ کا کلام صف پر ملاحظہ ہو۔

نوحؔ

محمد نوح نام نوحؔ تخلص وطن نارا ضلع الہ آباد سنہ ولادت ۱۸۷۹ شاعری
میں حضرات امیر محبتؔ۔ امیر مینائی۔ جلالؔ لکھنوی اور داغؔ دہلوی کا تلمذ حاصل ہے۔
آپ غزلیں اور صرف غزلیں کہتے ہیں الفاظ کی الٹ پھیر سے شعر کو بلند
کر دیتے ہیں یدطولیٰ حاصل ہے زبان کے اشعار پرانے رنگ میں خوب کہتے ہیں۔
آپ کے شاگردوں کی تعداد کافی ہے آپ اپنے مقطع میں ہمیشہ "طوفان نوح" اٹھایا
کرتے ہیں۔

دلؔ

ضمیر حسن نام دلؔ تخلص وطن شاہجہانپور فارسی کتب درسیہ کی تکمیل

کے بعد عربی تعلیم حاصل کی صرف و نحو سے فراغت کے بعد مولوی سید محمد علی خاں صاحب نیاز سے معقول کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ حدیث۔ تفسیر کی تعلیم مولوی بشیر احمد مراد آبادی سے حاصل کی بعد ازاں طب پڑھی آپ پندرہ برس کی عمر سے شاعری کرتے ہیں۔ پہلے بغیر اصلاح یہ مشغلہ جاری رہا اور بعد کو حضرت امیر مینائی سے اصلاح لینی شروع کی رنگ تغزل میں دہلی کی تقلید فرماتے ہیں اور جذباتی رنگ کو پسند فرماتے ہیں۔ آپ کو تصنع سے ہمیشہ احتراز رہا۔ آپ کا اساتذہ میں شمار ہوتا ہے کلام بلند اور خوب ہوتا ہے۔ آپ کا کلام صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

وحشت

رضا علی نام وحشت تخلص ولادت ۱۸۸۱ء وطن کلکتہ آپ غالب کے رنگ میں خوب کہتے ہیں اور ۱۹۱۱ء میں جب آپ کا دیوان شایع ہوا جس میں کچھ فارسی کلام بھی ہے۔ تو مولانا حالی۔ علامہ شبلی حضرت ظہیر دہلوی اور دیگر اکابر عصر نے ان کی بہت تحسین کی اور مولانا حالی نے یہ فرمایا کہ تتبع غالب کا حق ادا کر دیا۔

آپ اسلامیہ کالج کلکتہ میں پروفیسر تھے اور آپ کو ۱۹۳۰ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ آپ کا کلام صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

سائل

نواب سراج الدین احمد خاں نام سائل تخلص وطن دلی ولادت ۱۸۶۷ء آپ مرزا داغ کے داماد اور شاگرد خاص تھے۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو آپ کا انتقال ہوگیا آپ نہایت کہنہ مشق اور اچھے شاعر تھے۔ نہ صرف دلی بلکہ پورا ہندوستان آپ کی شاعری کا لوہا مانتا ہے۔ مشاعروں میں ترنم سے غزل پڑھنے کی ایجاد کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

بیخود

سید وحید الدین نام بیخود تخلص سنہ ولادت ۱۸۷۶ء آپ کو ابتدا سے ہی شاعری کا ذوق تھا۔ مولانا حالی کی تحریک سے جہاں استاد حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔ آپ کا اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کا کلام صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

فراق

رگھو پتی سہائے نام فراق تخلص پیدائش ۲۸ر اگست ۱۸۹۶ء بمقام

گورکھپور جہاں موصوف کا خاندان تین چار سو برس سے آباد ہے۔ آپ کے والد حضرت عبرت گورکھپوری آزاد وحالی کے بہت مشہور ہمعصر تھے ان کی کچھ نظمیں ابتک اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور مسدس "نشوونمائے ہند" و مثنوی حسن فطرت ان کی بہت مشہور تصانیف ہیں۔ حضرت فراق کے خاندان کی فضا علمی اور فلسفیانہ زیادہ اور شاعرانہ کم تھی حضرت فراق ایم۔ اے پاس کر کے اور بہت سی تحریکوں میں شریک ہونے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں اب انگریزی علم و ادب کے پروفیسر ہیں۔ ان کی شاعری ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی آئینہ داری اور ان کے کلام میں اسی دل کی دھڑکن ملتی ہے جو قدیم ہندوستانی ادب اور کلچر میں دھڑک رہا ہے۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں رچاؤ۔ ترنّم، لطافت و رنگینی کی انتہا دیکھنا ہو تو فراق کا کلام دیکھئے۔ آپ کا کلام صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

احسانؔ

احسان الحق نام، احسانؔ تخلص پیدائش ۱۹۱۴ء آبائی وطن قصبہ باغپت ضلع میرٹھ ہے لیکن آپ کے والد ماجد ترک وطن کر کے کاندھلہ ضلع مظفرنگر چلے آئے تھے۔ اور آپ کا بچپن یہیں گذرا۔ آپ کے والد اچھی خاصی جائداد کے مالک

تھے لیکن شرافت اور مروت نے تمام جائداد پر سرمایہ دار اقربا کے ہاتھ میں پہونچادیا
اور آپ کے والد کے پاس اتنا بھی نہ رہا کہ آپ کی تعلیم کا بار اٹھا سکتے۔ آپ نے صرف
درجہ چہارم تک تعلیم پائی۔
شاعری کے فطری رجحان اور کتب بینی کے شوق نے آپ کو بلند مرتبہ
شاعر بنا دیا۔ آپ نظمیں خوب کہتے اور پڑھتے ہیں۔

اخترؔ

جاں نثار اختر نام، اخترؔ تخلص آپ ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے۔
ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۳۶ء میں
بی اے آنرز اور ۳۹ء میں ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس دوران
میں آپ علیگڑھ یونیورسٹی میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے اور انجمن اردوئے
معلی اور انجمن حدیقۃ الشعر کے سکریٹری کی خدمات بھی انجام دیں۔ آپ کی شاعری
صحیح معنوں میں علی گڑھ ہی میں پروان چڑھی، آپ کی نظموں کا ایک مجموعہ "سلاسل"
شایع ہو چکا ہے
جس میں رومانی اور انقلابی دونوں طرح کا کلام ہے۔ دوسرا مجموعہ
"پرتو" مکتبہ اردو لاہور سے شایع ہو رہا ہے۔

آلم

محمد اسحاق نام آلم تخلص وطن مظفر نگر۔ آپ علامہ سیماب کے شاگرد ہیں آپ کی غزلیں نظمیں ہر معیاری رسالہ میں نظر آتی ہیں۔

آپ کا دیوان "سلسبیل" "عالمگیر" بکڈپو میں زیر طبع ہے موجودہ دور کے نوجوانوں میں آپ خوب کہتے ہیں اور آپ کا شمار مشاہیر میں ہوتا ہے۔

میں خود اپنی نظر میں !!

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر، جو ہوں تو کیا ہوں میں
(حضرت جگر مرادآبادی)

"سوانح حیات" لکھنا ایک ایسی "رسم فرسودہ" ہو چکی ہے ..... جسکی تقلید میرے "جذبات و احساسات کی جرأت کے سوا اور کچھ نہیں ـــــ

کون ہوں، کیا ہوں، شعر مجسم! نغمہ سراپا..... ایک ایسی نکہت جس نے کانٹوں کو بھی مست و سرشار کر دیا ہے ؎

کلی کلی کو عطا کی شگفتگی میں نے
چمن میں پھونک دی اک روح زندگی میں نے

شاعرہ پیدا ہوئی، شاعرہ ہوں.... مروں گی بھی ــــ میں اپنے کو تاریخ کے زنگ آلودہ دام میں مقید کرنا عذاب جان سمجھتی ہوں.... اگر آپ مجھ سے متعارف ہونا چاہتے ہیں تو میرے کلام، نظم و نثر کو پڑھیے۔

لکھنؤ میرا آبائی وطن ہے۔ دریائے گومتی کے کنارے لال محل، موتی محل، ہیں میرا خاندان، قدیم سلطنت اودھ کا ایک ممتاز ترین خاندان کبھی شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا.... ثانوی وطن حیدرآباد دکن.... ثانوی یوں کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں ۱۶ مارچ کو فضائے حیدرآباد میں آنکھ کھولی اور تعلیم و تربیت کے زیور سے اپنی زندگی کو آراستہ کیا.... لیکن خاندان، وطن، پیدائش اور تربیت ان چیزوں سے کسی کو کیا واسطہ!

سیدہ اختر نام ہے اور خوش قسمتی سے علامہ سیماب مدظلہ نے کل ہند ادارۂ اردو کانفرنس و مشاعرہ منعقدہ ۹ ار نومبر ۱۹۴۲ء (بنگلور) کے موقعہ پر مجھے زہرۂ سخن" اور جناب عبدالحامد صاحب بدایونی نے کل ہند مسلم لیگ کانفرنس ۱۹۳۸ء دگورکھپور کی جانب سے خطیبۂ ہند بھی بنا دیا ــــ رہ گیا صدر کل ہند خواتین مسلم لیگ ہونا تو اس کے لئے خواتین ہند کی عموماً اور بالخصوص خواتین دہلی کی شکر گذار ہوں ــــ جنھوں نے ۱۹۳۹ء میں اس خطاب کو میرے گلے کا ہار بنا دیا ــــ جب کبھی فرصت ہو تو، شعر و ادب کی کسوٹی پر مجھے پرکھیے، یقیناً آپ

متعارف ہو جائیں گے۔ ے

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا!
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے (مولانا اصغر گونڈوی)

اب رہ گئی میری قومی و ملی حیثیت تو ..... اس چمن میں ع

فصل بہار مست و خراماں ہنوز ہے

خودستائی نہ سمجھے تو اب اس سے زیادہ میں اپنے متعلق کچھ اور لکھنا گناہ سمجھتی ہوں ..... کہ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

تاباں و درخشاں
سیدہ اختر